محسن الدین نوشہ

بات لہو کی ہو یا خاک کی، تھوڑی رنگوں سے شرابور ہو جاتا ہے۔ زندگی کے انہی دو عناصر سے آراستہ پل پل رنگ بدلتی یہ رنگا رنگ روداد طبقاتی تفاوت کی ہے اور سیاسی عداوت کی بھی۔ سیاست وہ خود فراموش مشغلہ، وہ عجیب وغریب پیشہ ... وہ مدہوش کن نشہ ہے جس میں مبتلا ہونے والوں کو کہیں امان ملتی ہے اور نہ ہی وہ کسی کو امان دے سکتے ہیں۔ رشتوں اور محبتوں کی ہر قید و بند سے آزاد، یہ اسیرانِ بلا کسی کے اپنے رہتے ہیں نہ پرائے۔ خود سے وفائی کی آڑ میں بے وفائی کرتے، خود کو مضبوط کرنے کے دھوکے میں کمزور کرتے اور نفع کے لالچ میں گھاٹے کا سودا کرتے یہ اس نہج پر جا پہنچتے ہیں، جہاں ان کا اپنا سایہ بھی ان کی گھات میں ہوتا ہے۔ زندگی پر ڈھیلی پڑتی گرفت کے ان کٹھن لمحات کو نواب صاحب نے نہایت مضبوطی سے تحریر کا روپ دیا ہے ...

شراب کا نشہ چڑھتا ہے...... اتر جاتا ہے مگر اقتدار کا نشہ چڑھتا ہے تو آخری سانس تک نہیں اترتا۔

چودھری جلال اکبر اور چودھری بلال اکبر کی رگوں میں یہ نشہ لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔ سیاسی داؤ پیچ تو ان کی گھٹی میں پڑے تھے۔ دادا پردادا کے زمانے سے حاکمیت اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا تھا۔ دونوں بھائی آباواجداد کی روایتوں کے امین تھے۔ سیاسی میدان کے ایسے ماہر کھلاڑی تھے کہ کبھی کسی سے زیر ہونا نہیں جانتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ زبر ہیں، ہمیشہ زبردست رہیں گے۔

ان کا باپ چودھری لیاقت اکبر نیشنل اسمبلی کا رُکن تھا۔ اپنی سیاسی پارٹی میں بڑی اہمیت رکھتا تھا... کیونکہ اپنے حلقہ انتخاب میں بلا مقابلہ کامیاب ہو کر بڑے طمطراق سے نیشنل اسمبلی میں قدم رکھتا تھا اور وزارت ضرور حاصل کرتا تھا۔

جلال اکبر بڑا بیٹا تھا۔ باپ کی زندگی میں صوبائی اسمبلی تک محدود رہتا تھا۔ باپ کے بعد ایک ہی چھلانگ میں نیشنل اسمبلی کا ممبر بن گیا تھا۔ پورے علاقے میں ان کی چودھراہٹ کا دبدبہ ایسا تھا کہ تمام ووٹ انہی کی جھولی میں آتے تھے۔

بڑا بیٹا ایم این اے بن گیا تو چھوٹا بیٹا بلال اکبر بڑے بھائی کی جگہ صوبائی اسمبلی میں ایم پی اے بن کر پہنچ گیا۔

دولت اور طاقت جتنی ملے، اُتنی ہی کم لگتی ہے۔ بلال اکبر کے دل میں یہ پھانس چبھنے لگی کہ جلال اکبر بڑی آسانی سے نیشنل اسمبلی میں پہنچ گیا ہے جبکہ وہ صرف صوبائی اسمبلی تک ہی محدود رہے گا۔

اقتدار کی اونچی کرسی تک پہنچنے کے لئے دولت کے بعد طاقت اور وسیع اختیارات کی سیڑھی ضروری ہوتی ہے۔ ان بھائیوں میں یہ سب ہی چیزیں مشترک تھیں۔ اس کے باوجود بلال اکبر عمر میں چھوٹا ہونے کے باعث پیچھے رہ گیا تھا۔ جب تک بڑا بھائی سلامت رہتا تب تک وہ نیشنل اسمبلی کی سیٹ پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

الیکشن کے دنوں میں سب ہی مخالفین ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے ہیں۔ اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں مگر بلال اکبر ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ خاندانی بھرم قائم رکھنا ضروری تھا۔ ان کا باپ مرحوم چودھری لیاقت اکبر علاقے کا نامی گرامی پیر تھا۔ ان کے سیکڑوں عقیدت مند تھے، لہٰذا وہ دوسرے سیاستدانوں کی طرح بھائی کے خلاف محاذ آرائی کر کے اپنے باپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں پر کوئی غلط تاثر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

جلال اکبر بہت ہی شاطر دماغ رکھتا تھا۔ یہ خوب جانتا

تھا کہ وہ عقیدت مند اسے سیاست کے میدان میں کہیں سے کہیں پہنچا سکتے ہیں، لہٰذا ان کی تعداد بڑھانے کے لئے اس نے اپنے مرحوم والد کا ایک بہت ہی خوبصورت مزار بنوایا تھا۔ ہر جمعرات کی شب وہاں قوالی کا اہتمام ہوتا تھا اور نذر ونیاز کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ہر سال بڑی دھوم دھام سے عرس منایا جاتا تھا۔

چونکہ سیاسی قوت رکھتا تھا، وسیع ذرائع کا مالک تھا۔ اس لئے اس سالانہ عرس کا چرچا تمام اخبارات اور مختلف ٹی وی چینلو کے ذریعہ دور دور تک ہوتا رہتا تھا۔ اندر خواہ کتنا ہی سیاسی زہر بھرا ہو، اندر کون دیکھنے آتا ہے؟ شخصیت میں ایسی مٹھاس اور انکسار تھا کہ ملنے جلنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

اس روز بھی سالانہ عرس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بلال اکبر نے کہا۔ ''بھائی جلال! ابا جی کی قبر میں تو ہڈیاں رہ گئی ہوں گی مگر آپ وہاں سے بھی سونا نکال رہے ہیں۔ ایسی دھوم دھام کر رہے ہیں کہ آس پاس کے علاقوں سے بھی عقیدت مند آنے لگے ہیں۔ اگلی بار تو آپ کا ووٹ بنک دگنا ہو جائے گا۔''

وہ آنکھیں بند کر کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''بے شک، وہ ربّ جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت۔ میری کوشش ہے کہ ابا جی مرنے کے بعد بھی اپنے عقیدت مندوں کے دلوں میں زندہ رہیں۔ ان کے ایصالِ ثواب میں اضافہ ہوتا رہے۔''

''ربّ دیاں ربّ جانے ......اور ثواب میں اضافہ ہو نہ ہو لیکن یہاں عرس کے بہانے آپ اپنی سیاسی پوزیشن بہت مستحکم کر رہے ہیں۔''

''یہ مت بھولو کہ ہم ایک ہی پارٹی کے ٹکٹ پر ایم این اے اور ایم پی اے بنتے ہیں۔ ہمارے ووٹر ایک ہی ہیں۔ میرا بنک بیلنس بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا بھی ووٹ بنک بڑھنے والا ہے۔''

''درست کہتے ہیں آپ بھائی جلال! ہمارے ملک کی عوام عجیب ہے۔ سیاست میں مذہب کا تڑکا لگاؤ تو یہ بے چارے کشاں کشاں ووٹ دینے چلے آتے ہیں۔''

''یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ مجھے ابا جی سے کوئی عقیدت نہیں ہے؟ میں مریدوں اور عقیدت مندوں کی تعداد بڑھا کر اپنا اُلّو سیدھا کر رہا ہوں؟''

''کیا یہ سچ نہیں ہے؟''

وہ اس کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''سچ اتنا ہی اچھا لگتا ہے، جتنا حلق سے اتر سکے۔ تم سیاست میں ہو۔ سیاسی چالوں کو اچھی طرح سمجھتے ہو لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ مجھے ابا جی سے بہت لگاؤ ہے۔ سب ہی جانتے ہیں۔ تم بھی جانتے ہو، میں ان کی زندگی میں ان کی پرچھائیں بنا رہتا تھا۔''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جب اندھیرا ہوتا تھا تو پرچھائیں ساتھ چھوڑ دیا کرتی تھی۔''

''یہ تو ہوتا ہی ہے۔ وہ قبر کے اندھیروں میں جا چکے ہیں، ساتھ تو چھوٹنا ہی تھا۔''

''وہ قبر میں گئے نہیں ہیں...... انہیں بھیجا گیا ہے۔''

''یہی بات تو دل پر گھونسے کی طرح لگتی ہے۔ چار برس گزر چکے ہیں لیکن اب تک ان کے قاتل کا کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔''

بلال اکبر نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ''یہ سوچ سوچ کر خون کھولتا ہے کہ ہمارے ابا جی کی سانسیں چھیننے والا اس دنیا میں کہیں سانسیں لے رہا ہوگا۔ بس ایک بار اس کا سراغ مل جائے۔ ربّ دی سوں...... اسے گولیوں سے بھون ڈالوں گا۔''

جلال اکبر نے کہا۔ ''اپنے قاتل کو زندہ دیکھ کر ان کی روح بے چین رہتی ہوگی۔''

''مجھے تو ان کی قبر پر جاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ ہمارے پاس دولت، طاقت، وسیع ذرائع اور لامحدود اختیارات ہیں پھر بھی ابا جی کا قاتل ہماری گرفت میں نہیں آ رہا ہے۔''

''ہم نے کسی سے زیر ہونا نہیں سیکھا۔ کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا لیکن وہ قاتل ہم سے چھپ کر، فتح یاب ہو کر ہمارے لئے چیلنج بن گیا ہے۔ میں جب تک اسے سزا نہیں دوں گا، مجھے چین نہیں آئے گا۔''

''ہم ہمیشہ یہی قسم کھاتے ہیں۔ وہ قاتل بڑا چالباز ہے۔ اپنے جرم کا کوئی ایک سرا بھی ہمارے ہاتھ نہیں آنے دے رہا ہے۔''

اس نے تائید میں سر ہلایا پھر کہا۔ ''جرم کو لاکھ چھپاؤ، وہ کبھی نہ کبھی بولتا ضرور ہے۔ وہ جلد یا بہ دیر ہماری گرفت میں ضرور آئے گا لیکن مجھے تم سے شکایت ہے۔ اس سلسلے میں تم مجھ سے کوئی صلاح مشورہ کیوں نہیں کرتے؟''

''میں اپنے طور پر اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ یوں بھی آپ کی اور میری کارروائی میں بہت فرق ہے۔ آپ اکثر شک کی بنیاد پر کسی نہ کسی کو پکڑ لیتے ہیں اور میں ٹھوس ثبوت

کے بغیر کسی بندے پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

جلال اکبر نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ''جب تک شیر پکڑا نہیں جاتا تب تک بکریوں کی کھالیں اتاری جاتی ہیں۔ اس طرح روپوش رہنے والے شیر پر ہیبت طاری رہتی ہے۔ خوف و دہشت کے باعث اس سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ آپ ہی آپ بے نقاب ہو جاتا ہے۔''

''اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ آپ اپنے طور پر کوشش کرتے رہیں۔ میں بھی کر رہا ہوں۔ دیکھتے ہیں' پہلے کون قاتل تک پہنچتا ہے؟''

پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔ جلال اکبر بڑے شاہانہ انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ چھوٹے بھائی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی وقت سوچ کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ کسی نے اسے پکارا۔ ''چودھری جی......!''

بڑی کھنکتی ہوئی آواز تھی۔ اس نے فوراً ہی سر گھما کر اندرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ آواز میں جیسی کھنک تھی' ویسی ہی وہ سراپا کھنکتی ہوئی سی لگی۔ اگرچہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی لیکن تاڑنے والے بند لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ وہ اپنی نیت کو ڈھانپ رہا تھا اور اسے بھانپ رہا تھا۔

اس کی بے باک نظریں ایسی تھیں کہ وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی' چادر میں لپٹنے لگی۔ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''مجھ...... مجھے ابا نے بھیجا ہے۔''

وہ بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''کس کے ابا نے بھیجا ہے؟''

''میرے...... میرے ابا نے۔''

وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''تمہارے ابا کا کوئی نام تو ہوگا؟''

''جی...... وہ امام دین......''

وہ مونچھوں کو مروڑتے ہوئے بولا۔ ''اچھا' تم ماسٹر امام دین کی بیٹی ہو؟ کیا نام ہے تمہارا......؟''

وہ ہچکچانے لگی۔ ''جی...... وہ......''

''کیا اپنا نام یاد نہیں ہے؟''

''ثریا...... میرا نام ثریا ہے۔''

وہ اس کے نام کو دہراتے ہوئے بولا۔ ''ہوں' ثریا...... ماسٹر کی بیٹی ہو۔ پڑھی لکھی تو ضرور ہو گی؟''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔ ''جی' میٹرک تک پڑھا ہے۔''

''میں نے پہلے کبھی تمہیں حویلی میں نہیں دیکھا؟''

''میں کبھی کبھار آتی ہوں۔ وہ بھی چودھرائن سے جاتی ہیں۔''

''کسی کام سے آئی ہو؟''

وہ ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ ابا نے تقریر لکھ دی ہے۔ وہ خود یہاں آتے پر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

وہ کاغذ لیتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہوا ہے اسے......؟''

''رات سے کھانسی کے جھٹکے لگ رہے ہیں' منجی سے اٹھا نہیں جا رہا ہے۔''

وہ کاغذ کھول کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر کو دکھایا......؟''

وہ مختصر سا جواب دیتے ہوئے بولی۔ ''جی دکھایا ہے۔ اب میں جاؤں؟''

وہ کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چلی جانا۔ پہلے یہ تقریر پڑھ کر سناؤ۔''

اس نے ہچکچا کر اسے دیکھا۔ ''جی......؟ مم......''

''ارے...... تم تو ایسے گھبرا رہی ہو جیسے ماسٹر نے تمہیں چنے دے کر پڑھایا ہے؟ لو۔ پڑھو اسے...''

وہ علاقے کا چودھری تھا۔ اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ ابھی نرمی سے فرمائش کر رہا تھا۔ انکار کرنے پر گرمی بھی دکھا سکتا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے وہ کاغذ لے لیا۔ بدن کے روئیں روئیں سے پسینا پھوٹ رہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک اس تحریر کو دیکھتی رہی۔ باپ نے خواتین کے حقوق دلانے کے سلسلے میں بڑی عمدہ تقریر لکھی تھی۔ مگر اسے چودھری کے سامنے پڑھنا بوجھ لگ رہا تھا۔ وہ جھجکتے ہوئے دھیمی آواز میں پڑھنے لگی۔ جلال اکبر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''کیا بکری کی طرح منمنا رہی ہو؟ اونچی آواز میں پڑھو......''

حلق میں جیسے کانٹے سے پڑ رہے تھے' وہ تھوک نگل کر پھر سے پڑھنے لگی۔ اس بار آواز ذرا اونچی تھی۔ جلال اکبر اسے سرتاپا دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی چال بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''وہاں کھڑے کھڑے تھک جاؤ گی۔ یہاں آ کر بیٹھو۔''

وہ انکار کرتے ہوئے بولی۔ ''نن...... نہیں۔ میں یہاں ٹھیک ہوں۔ ابا گھر میں اکیلے ہیں۔ مجھے جلدی جانا ہے۔''

''کھڑے رہ کر جتنی دیر میں پڑھو گی۔ بیٹھ کر بھی اتنی ہی دیر لگے گی۔ چلو' آؤ' ادھر بیٹھو۔''

...کال کر رہا تھا۔ وہ فون کو کان سے لگاتے ہوئے بولا۔
''ہاں۔ بولو۔ کیا ہو رہا ہے؟''
سر عُرس کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ آپ کے حکم کے مطابق حقوقِ نسواں کے بینرز بھی سجا دیے گئے ہیں۔ خواتین کی حمایت میں ایسے ایسے فقرے لکھے ہیں کہ اس بار آپ کی جھولی میں عورتوں کے زیادہ ووٹ آئیں گے۔''
وہ اپنے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''پہلا ووٹ تو الیکشن سے پہلے ہی آ گیا ہے۔''
سیکریٹری نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ ''جی سر......!''
اس نے کوئی جواب دیے بغیر رابطہ ختم کر دیا اور قالین پر پڑے ہوئے تقریر کے کاغذ کو اٹھا کر گھورنے لگا۔ ایسے ہی وقت اس کے ایک خاص ماتحت راؤ رُستم نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ ''ابھی ماسٹر کی بیٹی آئی تھی؟''
''ہاں۔ تم تو جانتے ہو، ماسٹر میرے لئے بڑی زوردار تقریریں لکھتا ہے۔ لیکن آج اس کی بیٹی اپنا زور دکھا کر گئی ہے۔ سب ہی جانتے ہیں' مجھے انکار سننے کی عادت نہیں ہے۔''
وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''آپ حکم کریں سرکار......!''
وہ ٹہلنے کے انداز میں اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے بولا۔ ''پھول باغ میں کھلے یا کیچڑ میں۔ پھول ہی کہلاتا ہے۔ ہم بس اسے اپنے گلدان میں سجانا چاہتے ہیں۔ وہ غربت کی غلاظت میں کھلی ہے، اسے یوں توڑ کہ کیچڑ ساتھ نہ آئے۔''
''فکر نہ کریں سرکار! ایسے معاملات میں میرا ایسٹر طوفانی رفتار سے گھومتا ہے۔ ایسی چال چلوں گا کہ وہ اپنے پیروں سے چل کر آپ کے قدموں میں آئے گی۔''

کیا طرفہ تماشا تھا؟ کچھ دیر پہلے وہ آزادیِ نسواں کی بات کر رہا تھا پھر خود ہی اس آزادی کا گلا گھونٹنے کے منصوبے بنانے لگا۔ سیاست اسی کو کہتے ہیں۔ یہ ایسا کھیل ہے جو کرسی کے اوپر اور کرسی کے نیچے ساتھ ساتھ کھیلا جاتا ہے۔

☆☆☆

چودھری لیاقت کا عُرس بڑے پیانے پر منایا جاتا تھا۔
وہ اپنی زندگی میں نیشنل اسمبلی کا رُکن بھی تھا اور اپنے علاقے کا پیر بھی مانا جاتا تھا۔ اس مقتول پیر کے بعد جلال اکبر ایم این اے اور بلال اکبر ایم پی اے منتخب ہونے لگے۔ وہ ہر الیکشن میں بلا مقابلہ کامیاب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچتے تھے۔

ان کی میلوں دور تک پھیلی ہوئی زمینوں پر رہنے والے لاکھوں افراد دراصل ان کی رعایا تھے۔ سیکڑوں نمک خوار تھے۔ ہزاروں افراد ایسے تھے جن کے باپ دادا بھی ان کی زمینوں پر رہتے آئے تھے' لہٰذا وہ ان کے دباؤ میں رہتے تھے۔ وہاں پیر صاحب کے ہزاروں مرید اور لاکھوں عقیدت مند تھے۔ ہر جمعرات کی شام اس کے مزار پر پھول چڑھانے' چادریں چڑھانے اور فاتحہ پڑھنے والوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔
اس روز بھی سالانہ عُرس کے حوالے سے میلہ لگا ہوا تھا۔ دور دور کے پنڈ سے مرد' عورتیں' بچے بوڑھے سب ہی آئے ہوئے تھے۔ کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ عورتوں کے رنگ برنگے ملبوسات نے اس میلے کو اور زیادہ رنگین بنا دیا تھا۔
مزار کے اندر اور باہر قیمتی سنگِ مرمر جڑا ہوا تھا۔ وہ اونچائی پر تھا۔ میلوں دور سے اس کی چمک دمک آنکھوں کو متوجہ کر لیتی تھی۔ فرش اتنا چکنا تھا کہ پنڈ کی عورتیں اور بچے اس پر چلتے وقت عجیب سی فرحت محسوس کرتے تھے اور متاثر ہو کر فیصلہ کرتے تھے کہ یہی ہمارے وڈے ہیں۔ ووٹ صرف انہی کو دینا چاہئے۔ انہی کے سامنے جھکنا چاہئے۔
پیر لیاقت اکبر کی پھولوں سے لدی ہوئی قبر پر فاتحہ پڑھنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ قبر کے دوسری طرف لوہے کی جالیاں تھیں۔ ان جالیوں کے پار عورتیں آ کر فاتحہ پڑھتی اور منتیں مانتی تھیں۔ وہاں رُستم کی جوان بیٹی شہناز بھی آئی تھی۔ دونوں ہاتھ اُٹھا کر دعائیں مانگ رہی تھی مگر اس کی نظریں مردانہ حصے کی طرف بلال اکبر پر جمی ہوئی تھیں۔
بلال اس کی طرف دیکھتا تو وہ فوراً ہی نظریں جھکا لیتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے مرحوم والد پیر لیاقت سے کہہ رہا تھا۔ ''ابا جی...... ایہ لڑکی میرے دل و دماغ میں سمائی ہوئی ہے۔ یہ ہمارے جوتوں میں رہنے والے ایک قاتل بدمعاش کی بیٹی ہے۔ میں اس سے نکاح نہیں پڑھا سکتا۔ ماں جی اور خاندان کے بزرگ اسے چودھرائن تسلیم نہیں کریں گے۔ آپ زندہ ہوتے تو آپ بھی اسے بہو بنانے پر راضی نہ ہوتے۔''
اس نے عورتوں کے ہجوم میں کھڑی ہوئی شہناز کو بڑی چاہت سے دیکھتے ہوئے سوچا ''میں کیا کروں ابا جی...! میں آپ کی طرح اور بھائی جلال کی طرح پرائی لڑکیوں کے ساتھ گناہ نہیں کر سکتا۔ یہ تو آپ بھی جانتے تھے کہ میں ہوس پرست نہیں ہوں۔ آپ سچ مچ کے پیر ہوتے تو منت مانتا کہ

وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ جھجکتی ہوئی، چادر میں لپٹتی ہوئی قریب آنے لگی۔ چال بڑی مستانی تھی۔ چادر کو بھی مستی سوجھی تھی۔ اِدھر سے اُدھر ڈھلک رہی تھی۔ اس چادر کو سنبھالنے کی اداؤں میں بھی بڑی دلکشی تھی۔ وہ اس سے ذرا فاصلہ رکھتے ہوئے قالین پر سمٹ کر یوں بیٹھ گئی جیسے کسی نے وہاں کپڑے کی گٹھڑی رکھ دی ہو۔ وہ باپ کی لکھی ہوئی تحریر پڑھ رہی تھی اور وہ چادر کے حاشیوں سے جھلکتی ہوئی سرخیاں حرف بہ حرف پڑھنے لگا۔ دور کا نظارہ ذرا پاس آ کر اور بھی حسین ہو گیا تھا۔

وہ اٹک اٹک کر پڑھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ جلال اکبر کی شیطانی نظریں گدگدی کر رہی ہیں۔ ایسے وقت لڑکیاں بڑی مجبور ہوتی ہیں۔ شیطان کی آنکھیں نہیں پھوڑ سکتیں۔ وہ پڑھ رہی تھی اور کسمسا رہی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا۔ آواز میں ایسی لرزش آ گئی تھی' جیسے ابھی رو دے گی۔

جلال اکبر نے اس کی طرف جھک کر بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ آرام سے پڑھو۔ کچھ تحریریں ٹھہر ٹھہر کر' ذرا چبا کر پڑھنے کے لئے ہوتی ہیں۔''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''مجھ سے نہیں پڑھا جائے گا۔ مجھے جانے دیں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب ایک صوفے پر آ گیا۔ ثریا کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ سرک کر دور ہونا چاہتی تھی۔ ایسے ہی وقت جلال نے اس کے شانے کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''میں کبھی خود سے چل کر کسی کے پاس نہیں آتا۔ تم خوش نصیب ہو۔''

وہ غصے اور نفرت سے لرز رہی تھی۔ اس کی شیطانی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس لئے حویلی میں کم کم ہی آیا کرتی تھی۔ وہ کھسک کر دور ہٹتے ہوئے بولی۔ ''دیکھیں چودھری جی......! ام۔ میں......''

وہ ایک ہائے کے ساتھ بولا۔ ''ہائے چودھری جی.... تمہارے منہ سے بڑا میٹھا لگ رہا ہے۔ ذرا پھر سے کہو......''

وہ ایکدم سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ابا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں چلتی ہوں۔''

وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا' مسکراتے ہوئے بولا ''جب سے آئی ہو۔ جانے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کیا میری اجازت کے بغیر جا سکو گی؟''

وہ اس سے کترا کر دروازے کی طرف جانا چاہتی تھی، اس نے فوراً ہی لپک کر اس کی کلائی تھامتے ہوئے کہا۔ ''کیوں کترا رہی ہو؟ کیا میری برتری سے ڈرتی ہو؟ چلو...... تمہارے لئے کمتر ہو جاتا ہوں۔''

اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں۔ وہ کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''خاک وہیں پہنچتی ہے' جہاں کا خمیر ہوتا ہے۔ آپ نے برتری سے کمتری کی طرف جانے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا۔''

وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اصل حاکم وہی ہوتا ہے جو پیار سے دل جیت لیتا ہے۔ دیکھو کتنی محبت سے سمجھا رہا ہوں' مان جاؤ۔ مچھلی بنو گی' ہاتھوں سے پھسلنا چاہو گی تو میں جال بن جاؤں گا۔''

وہ ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''کسی بھول میں نہ رہو۔ میں تمہارے ہاتھ آئی ہوں نہ آؤں گی۔''

''جو چیزیں ہماری ہوتی ہیں، ہم اُن تک پہنچ جاتے ہیں۔''

وہ دھیرے دھیرے اس کے قریب ہونے لگا۔ وہ ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''مجھ سے دور رہو۔ نہیں تو.....نہیں تو میں شور مچاؤں گی۔''

''بہت خوب......یعنی میرے نام سے بدنام ہونا چاہتی ہو؟''

وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک دیوار سے جا لگی۔ ان کے درمیان دو قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ فرار کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ وہ بولا۔ ''میں چیخنے والوں کی آواز ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا ہوں۔ اپنے شکار کو دوڑا دوڑا کر تھک جانے' ہانپ جانے اور خود کو پیش کر دینے پر مجبور کر دیتا ہوں۔''

وہ باقی رہ جانے والے فاصلے کو بھی ختم کر دینا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک زور کا طمانچہ منہ پر پڑا۔ اس نے بے یقینی سے دیدے پھاڑ کر اس کمزور سی لڑکی کو دیکھا۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اسے دھکا دیتی ہوئی اس کمرے سے بھاگ گئی۔

جلال اکبر کے پورے وجود میں گرمی سی بھر گئی تھی۔ اس نازک سے تھپڑ نے اس کے جاہ و جلال کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ اپنے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''میں سہمی ہوئی ہرنی سمجھ رہا تھا، یہ تو اڑیل گھوڑی نکلی۔''

وہ کچھ دیر تک دروازے کی طرف گھورتا رہا پھر بڑی خباثت سے مسکرا کر بولا۔ ''ویسے اڑیل گھوڑی کو لگام دینے کا مزہ آ جائے گا۔''

ایسے ہی وقت موبائل فون کا بزر بولنے لگا۔ اس کا پی اے

شہناز میری دلہن بن جائے گی تو آپ کی قبر پر ریشم کی چادر چڑھاؤں گا مگر آپ اس قابل ہی نہیں ہیں۔ پیر بن کر ہزاروں... ووٹ ہمیں دلاتے ہیں لیکن اس بیٹے کی جھولی میں ایک من پسند چھوکری نہیں ڈال سکتے۔"

وہ صرف دکھاوے کی غرض سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے عورتوں کے ہجوم میں شہناز بھی دونوں ہاتھ اٹھائے اسے مانگ رہی تھی۔ "یا پیر لیاقت بابا......! آپ لیاقت والے ہیں تو میرے دل کی مراد پوری کریں۔ یہ جب بھی ملتے ہیں، دور ہی دور سے باتیں کرتے ہیں۔ مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر کبھی ہاتھ نہیں لگاتے۔ انہیں دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ چودھریوں کے دلوں میں بھی خوف خدا ہوتا ہے۔ میرے دل کی ایک ہی مراد ہے۔ بس میں کسی طرح ان کے قدموں کی خاک بن جاؤں۔"

ایسے ہی وقت شور اٹھا کہ وڈی چودھرائن آ گئی ہیں۔ تمام مرد ایک طرف ہو گئے۔ ماں جی ماتمی لباس پہنے، اپنے بڑے بیٹے جلال اکبر کے ساتھ وہاں آئی۔ اس کے پیچھے دو ملازم پھولوں کی چادر اٹھائے ہوئے تھے۔ ماں جی اور دونوں بیٹوں نے وہ چادر ان سے لی پھر اسے بڑی عقیدت سے قبر پر چڑھا دیا۔ اگر بتیاں سلگائی گئیں پھر ان تینوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو سب ہی نے ہاتھ اٹھا لئے۔

ماں جی نے بلند آواز سے ایک آیت پڑھنے کے بعد کہا۔ "چودھری جی......! میں دن رات آپ کی مغفرت کے لئے دعا میں مانگتی رہتی ہوں۔ خود کلام پاک کی تلاوت کرتی ہوں اور مسجدوں میں قرآن خوانی کا سلسلہ جاری رکھتی ہوں۔" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "مگر میرے دل کو سکون نہیں ملتا۔ ربّ جانتا ہے' جب تک آپ کے قاتل کو سزا نہیں ملے گی تب تک مجھے سکون نہیں ملے گا۔ میرے دونوں بیٹے بھی جانتے ہیں...... یہ جانتے ہیں' آپ کی روح بھی بے چین ہو گی۔ لیکن انہیں سیاست سے اور عیش و عشرت سے فرصت نہیں ملتی ہے۔"

وہ جب بھی شوہر کے مزار پر آتی تھی تو اسی انداز سے بیٹوں کی کوتاہی بیان کرتی تھی۔ اس روز عُرس میں آئے ہوئے بے شمار افراد وہاں موجود تھے۔ جلال اکبر ان کی موجودگی میں جھینپ رہا تھا۔ بلال اکبر نے یوں آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے دنیا والوں سے چھپ رہا ہو۔

جب ماں جی بولتے بولتے ذرا چپ ہوئی تو بلال اکبر نے بلند آواز سے کہا۔ "ربّ جانتا ہے۔ ہم دونوں بھائی ہمیشہ یہاں آ کر قسمیں کھاتے ہیں پھر جی جان سے اس قاتل کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب ماں جی کے طعنے سہے نہیں جاتے۔ آج ان کے سامنے آخری قسم کھاتا ہوں' اگلے عُرس سے پہلے قاتل کو یہیں' ابا جی کے پاس لا کر اسے گولی ماروں گا۔ اپنے ربّ سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ مجھے قاتل تک پہنچنے کا کوئی راستہ دکھائے۔"

وہ آمین کہتا ہوا وہاں سے پلٹ کر باہر جانے لگا۔ شہناز بھی عورتوں کے ہجوم سے گزرتی ہوئی یوں جانے لگی جیسے مقناطیس کھینچ رہا ہو۔

جلال اکبر چھوٹے بھائی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے بھی بلند آواز سے دعا مانگتے ہوئے کہا۔ "ابا جی...! آپ پیر کامل ہیں۔ یقیناً میری آواز سن رہے ہوں گے۔ چھوٹے نے ایک برس کی مہلت لی ہے۔ یہ ابھی بچہ ہے۔ میں اس سے زیادہ وسیع اختیارات کا مالک ہوں۔ ایک ماہ کے اندر آپ کے قاتل کو یہاں لا کر گولی ماروں گا۔ میری یہ مراد پوری کریں کہ وہ قاتل میرے ہاتھ لگ جائے۔ میں ماں جی کے مزید طعنے نہیں سہہ سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ بھی پلٹ کر جانے لگا۔ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ "قسم پوری کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ کسی کو بھی گولی مار کر یہاں پھینک جاؤں گا۔ ماں جی کے طعنوں سے تو نجات مل جائے گی۔"

بلال اکبر باہر آنے کے بعد پجیرو میں بیٹھ گیا تھا۔ دو گن مین پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا عُرس کے ہنگاموں سے بہت دور آ کر رک گیا پھر پلٹ کر ایک گن مین سے بولا۔ "تمہاری بہن اسے یہیں لائے گی؟"

"جی سرکار......! میں نے اسے یہی جگہ بتائی ہے۔"

وہ دھڑکتے ہوئے دل سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ ہمیشہ سوچتا تھا۔ "میں دور ہی دور سے باتیں کرتا ہوں۔ اگر آج اسے چھو لوں تو کیا ہو گا؟ صرف چھونا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ میری نیت ٹھیک رہے گی۔ میرا ربّ جانتا ہے...... بالکل ٹھیک رہے گی۔"

وہ پیدل چھپتی چھپاتی آ رہی تھی۔ وہ اسے دور سے دیکھتے ہی خوش ہو گیا۔ اس کی سہیلی نے کہا۔ "دیکھو۔ چھوٹے چودھری کتنے بے چین ہیں؟ تمہارے انتظار میں ٹہل رہے ہیں۔ آج کسی طرح دوری ختم کرو۔ ان سے تو کبھی ہو گا نہیں۔ تم خود ہی اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھما دو۔"

شہناز نے کہا۔ "ان سے قریب ہو کر بھی جو فاصلہ رہ جاتا ہے' وہ بہت تڑپاتا ہے۔ پھر یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ

وہ میری کتنی عزت کرتے ہیں؟ مجھے گری پڑی لڑکی کی طرح دل بہلانے کی چیز نہیں سمجھتے ہیں۔"

سہیلی نے کہا۔ "میں یہیں رکتی ہوں۔ ان جھاڑیوں کے پیچھے رہوں گی۔ جتنی بھی دیر ہو میری فکر نہ کرنا۔"

وہ سر جھکائے تنہا چلتی ہوئی بلال کے قریب آ گئی۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کے آدمی کہاں ہیں؟"

"تمہاری سہیلی کی طرح انہوں نے بھی پردہ کیا ہے۔ اطمینان رکھو، ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "پھر بھی کھلی جگہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ کیوں نہ ہم گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

اس نے آگے بڑھ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ پہلے وہ اندر آئی پھر وہ آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ وہ جیسے چار دیواری کے اندر آ گئے تھے۔ کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ شہناز کے دل نے کہا۔ "اب تو ذرا قریب آ جاؤ۔"

ان کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔ صرف شہناز کو ہی نہیں، بلال کو بھی وہ میلوں کا فاصلہ لگ رہا تھا۔ وہ اسے بڑی حسرت سے دیکھنے لگا۔ اس کی گوری گلابی گلابی سی رنگت، سبز آنکھیں اور گوندھی ہوئی چوٹی کا پراندہ سامنے آ کر سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا سینے کی دھڑکنوں کے اوپر سے گزرتا چلا گیا تھا۔

وہ ایسا نظارہ تھا کہ منچلے دیکھتے تو جھپٹ پڑتے لیکن وہ ضبط کر رہا تھا۔ ہانپنے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔ ملتا ہوں تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ اپنے اندر لڑتا رہتا ہوں۔ جب دور ہو جاتی ہو تو تم سے ملنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، میں کیا کروں؟ نکاح کے بغیر تمہیں کس طرح اپناؤں؟"

وہ اب سے پہلے بھی ایسی باتیں سن چکی تھی اور اسے ہمیشہ کشمکش میں مبتلا دیکھتی تھی۔ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے عشق میں بیمار ہو جائے۔ اس نے اپنی سہیلی کے مشورے پر عمل کیا۔ اچانک اس کے گریبان کی طرف دیکھتے ہوئے پھر اپنا ہاتھ وہاں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ...... یہاں کچھ لگا ہوا ہے۔"

وہ نظریں جھکا کر پوچھنا چاہتا تھا کہ وہاں کیا لگا ہوا ہے؟ مگر سینے پر نرم و نازک ہاتھ کیا آیا، دل کی دھڑکنیں پاگل ہو گئیں۔ دل سینے کی دیوار سے یوں ٹکرانے لگا جیسے باہر نکل کر اس کے ہاتھ میں آنا چاہتا ہو۔

اس نے بے اختیار اس مکھن جیسے ہاتھ کو تھام لیا۔ زندگی

میں پہلی بار گلاب کی پتی کی پھسلتی ہوئی ملائمت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سنتا تھا کہ عورت ایسی ہوتی ہے لیکن سننے اور کتابوں میں پڑھنے کے بعد بھی یہ کبھی معلوم نہ ہوتا کہ کوئی شہناز جیسی سحر زدہ کرنے والی بھی ہوتی ہے۔ اس کے جی میں آرہا تھا، فوراً ہی اسے کھینچ کر بازوؤں میں بھر لے۔ یہ خیال آتے ہی وہ یکبارگی اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ گھبرا کر بولا۔ ”میں نے بھی وہی کیا جو دوسرے کرتے ہیں تو بعد میں بہت شرم آئے گی۔ میں حاکم ہوں جب ضروری ہوتا ہے تو ظالم بھی بن جاتا ہوں۔ شیر کا شکار بھی کر سکتا ہوں مگر تمہیں شکار نہیں کرنا چاہتا، اپنی عزت بنانا چاہتا ہوں۔“

”آپ اسی الجھن میں رہتے ہیں..... کچھ کر نہیں پاتے۔“

”اب میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔ یہ وعدہ کرتا ہوں، تم سے نکاح پڑھانے کے لئے دستور کے خلاف کچھ نہ کچھ کر گزروں گا۔“

وہ گاڑی سے باہر آکر بولا۔ ”تم سے جدا ہو کر پیاس اور بڑھتی ہے۔ اب جاؤ اس پیاس کو اور بڑھنے دو۔ میں جتنا تڑپتا رہوں گا، اُتنی ہی جلدی تمہارے پاس آتا رہوں گا۔“

شہناز گاڑی سے باہر آگئی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی۔ ”یہ درست کہہ رہے ہیں۔ ان کی دیوانگی بڑھتی رہے گی تو میرا ہی بھلا ہوگا۔“

وہ سر جھکائے جارہی تھی۔ بلال اسے بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ حاصل نہ ہوئی تو دیوانگی پاگل پن میں بدل جائے گی اور وہ ایسا مجبور بھی نہیں تھا کہ دیوانگی کی حد سے گزر کر پاگل ہو جاتا۔ چودھری ضدی ہوتے ہیں۔ وہ کسی دن بھی اچانک اپنی ضد پوری کر سکتا تھا۔

☆☆☆

چودھری لیاقت اکبر نے اپنی زندگی میں دونوں بیٹوں کے حصے مقرر کئے تھے۔ خاندانی وکیل ان کی وصیت کا امین تھا۔ اس کی ہلاکت کے بعد وکیل نے دونوں بھائیوں کو وہ وصیت نامہ پڑھ کر سنایا تو اس میں زمین کے ایک ٹکڑے کا ذکر نہیں تھا۔ اچانک ہونے والی موت نے اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ جائیداد میں ہونے والے تازہ ترین اضافے کے بارے میں کوئی وصیت تیار کرواتا۔ وکیل نے کہا تھا کہ مرحوم اس پانچ ایکڑ زمین کو کسی ایک بیٹے کے نام کرنا چاہتے تھے۔ موت دستک دے کر آتی تو وہ ضرور اپنی وصیت مکمل کرتے۔

جلال اکبر نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ”انہوں نے اشارتاً کچھ تو کہا ہوگا کہ وہ اس زمین کو کس بیٹے کے نام کرنا چاہتے ہیں؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں۔ وہ کسی الجھن میں تھے۔ انہوں نے کہا تھا، جلد ہی فیصلہ کریں گے لیکن موت نے انہیں مہلت نہیں دی۔“

وہ ایک بیٹا کون ہو سکتا ہے؟ جلال اکبر..... یا بلال اکبر.....؟ اس سوال کا جواب قبر کے مردے سے نہیں پوچھا جا سکتا تھا۔ وہ بیٹے تھے، باپ کے بعد کسی وصیت نامے کے محتاج نہیں تھے۔ تمام دولت اور جائیداد پر برابر کا حق رکھتے تھے۔ زمین کے اس ٹکڑے کو اپنے طور پر آدھا آدھا بانٹ سکتے تھے۔

لیکن ماں جی نے دونوں بیٹوں کو صاف کہہ دیا۔ ”باپ نے اپنی زندگی میں جو کچھ دے دیا، اسی کو بہت جانو۔ آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ اس پانچ ایکڑ زمین کا فیصلہ میں کروں گی۔“

جلال اکبر نے کہا۔ ”آپ وہ فیصلہ آج ہی سنا دیں۔“

ماں نے دونوں کو گہری سنجیدگی سے دیکھا پھر کہا۔ ”آج ہی سننا چاہتے ہو تو سنو۔ تم میں سے جو بھی باپ کے قاتل کو موت کے گھاٹ اتارے گا، میں وہ زمین اسی کے نام کروں گی۔“

دونوں بیٹوں نے ایک دوسرے کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ جلال اکبر نے کہا۔ ”میں پہلے ہی قسم کھا چکا ہوں، ایک ماہ کے اندر اس قاتل کو تلاش کروں گا اور اسے کتے کی موت ماروں گا۔“

بلال اکبر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”آپ کا تو یہ قول ہے کہ شیر نہ ملے تو اس کی جگہ بکری کو مار ڈالو۔ آپ کسی کو بھی ابا جی کا قاتل کہہ کر سزائے موت دیں گے تو میں ثبوت اور گواہوں کے بغیر تسلیم نہیں کروں گا اور ماں جی کو بھی تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔“

ماں نے تائید کی۔ ”بلال درست کہتا ہے۔ قاتل کو پورے ثبوت کے ساتھ اپنے انجام تک پہنچنا چاہیے۔“

جلال اکبر غصے سے بلال کو دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ان دونوں کے اندر اس زمین کے لئے ایک ہی بات چبھتی رہتی تھی کہ باپ کسی ایک بیٹے کو دینا چاہتا تھا اور دونوں کا خیال تھا کہ وہ بیٹا میں ہوں۔ بے حد وحساب جائیداد کے باوجود اس پانچ ایکڑ کی کمی دونوں کو کھٹکتی رہتی تھی۔

دو مُلاؤں کے درمیان مرغی حرام..... ان بھائیوں کے درمیان وہ زمین حرام ہوگئی تھی اور ان کی نیندیں بھی حرام ہو گئی تھیں۔ اس روز بلال اکبر اپنے حواریوں کے ساتھ وہاں

پہنچا ہوا تھا۔ اس کے مشیر نے دور سے دھول اڑاتی گاڑیوں کو آتے دیکھ کر کہا۔ "بڑے چودھری جی آ رہے ہیں۔"

بلال نے اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ یہاں کیوں آ رہے ہیں؟"

"سیدھی سی بات ہے جی! آپ سے پوچھ گچھ کرنے آ رہے ہوں گے۔"

وہ ناگواری سے زیر لب بولا۔ "میں ان کے کسی معاملے میں نہیں بولتا۔ مگر یہ ضرور اپنی ٹانگ اڑاتے ہیں۔"

گاڑیاں ان کے قریب آ کر رک گئیں۔ جلال اکبر اپنے گن مین کے ساتھ گاڑی سے اتر کر ان کے قریب آتے ہوئے بولا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

بلال نے کہا۔ "جب آپ کو میرے یہاں آنے کی خبر مل گئی ہے تو وجہ بھی معلوم ہو گئی ہو گی؟"

وہ اس کے حواریوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں سنی سنائی پر یقین نہیں رکھتا۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "تصدیق کرنے آئے ہیں؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہ نہ، تصدیق کرنے نہیں...... تمہیں ماں جی کا فیصلہ یاد دلانے آیا ہوں فی الحال یہ زمین نہ تمہاری ہے نہ میری......"

وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "مجھے یاد ہے۔"

"پھر یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں یہاں قالین کا کارخانہ لگانا چاہتا ہوں۔ اس سے ہماری صنعتی حیثیت بھی مستحکم ہو گی اور ہمارے لوگوں کو روزگار بھی ملے گا۔"

جلال اکبر نے سخت ناگواری سے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "...... بننا چاہتے ہو؟ اپنے پرکھوں کی عزت خاک میں ملانا چاہتے ہو؟ تمہاری کھوپڑی میں یہ بات آئی کیسے......؟"

"اس میں بننے والی کون سی بات ہے؟ یہ کام میں یا آپ نہیں...... ہمارے مزدور کریں گے۔ ہم آقا ہیں، آقا ہی بن کر رہیں گے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "ابا جی کے بعد حویلی کے ہر معاملے کی ویٹو پاور میرے پاس ہے۔ ہم چودھریوں کے مزاج کے خلاف یہاں کوئی کام نہیں ہو گا۔ یہ کارخانہ نہیں بنے گا۔"

اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تو پھر کیا بنے گا؟ پچھلے چار برسوں سے یہ زمین یونہی پڑی ہے۔ ہم چاہیں تو اس سے بہت منافع حاصل کر سکتے ہیں۔ یوں بے کار پڑے پڑے تو یہ بنجر ہو جائے گی۔"

"میں تم سے بڑا ہوں۔ اپنی تحویل میں آنے والی ہر چیز پر نظر رکھتا ہوں۔ یہاں کیا بنے گا، میں نے بہت پہلے سوچ لیا تھا۔"

اس نے اپنے منشی کو آواز دی۔ وہ فوراً ہی ایک بڑا سا تہہ شدہ کاغذ لے کر حاضر ہو گیا۔ جلال نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "یہاں ہماری مرضی کے مطابق شکاری کتے پالے جائیں گے۔ یہ مہنگی اور نایاب نسل کے کتوں کی پرورش کا ایسا ادارہ ہو گا کہ دنیا کے بڑے بڑے سرمایہ دار انہیں دیکھنے اور خریدنے یہاں آیا کریں گے۔"

پھر وہ منشی کے ہاتھ سے کاغذ لے کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھو۔ شہر کے نامی گرامی آرکیٹیکچر سے اس کا نقشہ بنوایا ہے۔"

بلال نے احتجاج کرنے کے انداز میں کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہیں بھائی جلال! آپ ابا جی کی زمین پر کتے پالیں گے؟"

"جانور پالنا ابا جی کا شوق رہا ہے۔"

"وہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے پالتے تھے۔ آپ نے

بزنس از بزنس......

محلے کا قسائی وکیل صاحب کے دفتر کا دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آیا اور قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا "وکیل صاحب...... وکیل صاحب...... ذرا جلدی سے بتائیے...... اگر کسی کا کتا میری دکان سے بکرے کی ران اٹھا کر لے جائے تو کیا میں اس پر ہرجانے کا دعویٰ کر سکتا ہوں؟"

"بالکل کر سکتے ہو۔" وکیل صاحب نے بلا تامل جواب دیا۔

قسائی نے گہری سانس لی اور بولا "بس...... تو پھر ٹھیک ہے...... ہرجانہ آپ کو ادا کرنا پڑے گا۔ آپ کا کتا میری دکان سے بکرے کی ران اٹھا کر بھاگ گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے......" وکیل صاحب ذرا بھی پریشان ہوئے بغیر مسکراتے ہوئے بولے "میرے مشورے کی کم از کم فیس ایک ہزار روپے ہوتی ہے...... ایسا کرو...... بکرے کی دوسری ران بھی میرے گھر بھجوا دو۔"

اصطبل بنانا ہی ہے تو گھوڑوں کا بنائیں۔ اونٹ بکریاں پالیں۔ کتوں کے شوق کو اپنی زمینوں تک محدود رکھیں۔ یہ زمین نہ آپ کی ہے نہ میری...... میرے کام پر آپ کو اعتراض تھا۔ اب میں اعتراض کرتا ہوں۔ یہاں کتوں کی پرچھائیں بھی نہیں آئے گی۔"

وہ سخت لہجے میں بولا۔ "اپنی عمر سے بڑے بننے کی کوشش نہ کرو۔ یہ زمین ہم میں سے کسی کے نام نہیں ہے لیکن بڑا بیٹا ہونے کے ناتے میں اباجی کی طرح کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہوں۔"

"آپ لفظوں کی ہیرا پھیری سے کام لے کر خود کو اس زمین کا مالک کہہ رہے ہیں۔"

"مالک نہیں ہوں تو کیا ہوا؟ فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہوں۔"

"اس زمین کے کسی بھی فیصلے کا اختیار ماں جی کے پاس ہے اور میں نے ان سے اجازت لینے کے بعد ہی یہاں قدم رکھا ہے۔"

وہ ماں کا حوالہ سن کر ذرا نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "اچھا۔ اس کا مطلب ہے' اوپر ہی اوپر کام ہو جاتے ہیں اور مجھے خبر نہیں ہوتی؟ خیر' ماں جی نے اجازت دی ہے تو ٹھیک ہے لیکن تم اس کا آدھا حصہ استعمال کرو گے۔"

"اب آپ بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔ خوانخواہ بخ لگا رہے ہیں۔"

"میں نے کہا نا۔ یہ میرا حق ہے۔ میں بھی ماں جی سے اجازت لے لوں گا۔ لہٰذا یہ بات پہلے سے ذہن میں بٹھا لو۔ آدھے پر تم اپنی من مانی کرو گے تو آدھے پر میری من مانی چلے گی۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ اس بہانے بٹوارہ کرنا چاہتے ہیں؟"

"اور تم کیا کر رہے ہو؟ میں تو پھر بھی انصاف سے کام لے رہا ہوں۔ تم تو پوری کی پوری زمین ہڑپ کر لینا چاہتے ہو۔"

وہ اس کاغذ کو منشی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا بھائی جلال! یہ نقشہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ آپ بھی پوری زمین پر قبضہ جمانے کی تیاری میں تھے۔"

پھر وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میرے اور آپ کے منصوبے میں بہت فرق ہے۔ میں منافع بخش کاروبار کرنا چاہتا ہوں اور آپ صرف اپنا شوق پورا کرنا چاہتے ہیں۔"

جلال اکبر نے کہا۔ "تم کچھ بھی سمجھو۔ میرا یہی آخری فیصلہ ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں' میں اس فیصلے کو نہیں مانتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ اپنے حصے کی زمین پر کاروبار کرو اور میرے حصے کو میری مرضی پر چھوڑ دو۔"

"مجھے یہ منظور نہیں ہے۔"

"نہ یہ منظور ہے' نہ وہ منظور ہے تو اسے یونہی چھوڑ دو۔ چار سال سے بیکار پڑی ہوئی ہے۔ آئندہ بھی پڑی رہے گی۔"

وہ حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنا کر وہاں سے چلا گیا۔

بلال اکبر غصے سے تلملا رہا تھا۔ اپنے مشیر سے قالین کے کارخانے کا نقشہ لے کر پھاڑتے ہوئے بولا۔ "میں اپنی بے عزتی کبھی نہیں بھولوں گا۔ کبھی نہیں......"

پھر وہ بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر دھول اڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ بھائی نے جیسے اس کے ارادوں کو اپنی ضد کی ٹھوکروں میں اڑا دیا تھا۔ یہ باور کرایا تھا کہ حاکمیت کی بساط پر چھوٹا بھائی محض ایک مہرہ ہے۔ بڑا جب چاہے' جیسے چاہے اس کی چال بدل سکتا ہے۔

بلال اکبر اچھی طرح جانتا تھا کہ بادشاہ کو مات دینے کے لئے کس طرح اس کے محافظ مہروں کو پہلے زیر کیا جاتا ہے؟ پھر اسے شہہ مات دی جاتی ہے۔

☆☆☆

اس واقعے کے بعد ثریا نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کبھی حویلی میں قدم نہیں رکھے گی۔ بڑے چودھری کے سائے سے بھی دور رہے گی۔ جلال اکبر کے لئے اس تتلی کے رنگ چرانا کچھ مشکل نہیں تھا مگر الیکشن قریب تھے' لہٰذا بدنامی کی کیچڑ سے بچنا ضروری تھا۔

چھوٹے لوگوں کے فیصلے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس روز حویلی میں میلاد اور قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن جلال اکبر کی بیوی نے خاص طور پر اسے بلاوا بھیجا تھا۔ وہ انکار نہ کر سکی۔

میلاد سے پہلے قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ حویلی میں خواتین کی اچھی خاصی تعداد جمع تھی۔ سب ہی تلاوتِ کلام پاک میں مشغول تھیں۔ وہ بھی ایک سپارہ لے کر پڑھنے لگی۔ ایسے وقت ایک بچے نے آ کر کہا۔ "ثریا باجی! آپ کو باہر کوئی بلا رہا ہے۔"

اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر سرگوشی میں پوچھا۔

''کون بلا رہا ہے؟''

وہ بولا۔ ''ڈیرے سے آیا ہے۔ کہتا ہے' آپ کے ابا نے اسے بھیجا ہے۔''

باپ کا نام سنتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سپارے کو سینے سے لگائے حویلی کے دروازے پر آ گئی تو وہاں جلال اکبر کا خاص ماتحت راؤ رستم کھڑا ہوا تھا۔ چہرے سے پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''ثریا بیٹی! تمہیں ابھی میرے ساتھ ڈیرے پر چلنا ہو گا۔ تمہارے ابا......''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہوا ابا کو......؟''

''کھانسی کا دورہ پڑا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے گر پڑے تھے۔ میرے ساتھی انہیں سنبھال رہے ہیں۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ آؤ۔ جلدی چلو......''

وہ باپ کی حالت سن کر رو پڑی۔ فوراً ہی اس کے ساتھ ڈیرے کی طرف جانے لگی۔ اس وقت سپارہ اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ رُستم لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے آگے آگے بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ کبھی دوڑ رہی تھی' کبھی تیز تیز چل رہی تھی۔

پندرہ منٹ بعد ہی وہ ڈیرے پر پہنچ گئے۔ ثریا نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''ابا کہاں ہیں....؟''

وہ عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''اُدھر... کمرے میں ہیں۔ آؤ......''

وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی ایک کمرے کے دروازے پر آ گئی۔ وہ اسے اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں حکیم صاحب کو بلا کر لاتا ہوں۔ تم اندر جاؤ۔''

وہ ادھ کھلے دروازے کو مکمل طور پر کھولتی ہوئی اندر آ گئی لیکن ویران کمرے اور خالی چارپائی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اسی وقت پیچھے کوئی کھٹکا ہوا۔ اس نے ایکدم سے پلٹ کر دیکھا۔ جلال اکبر دروازہ بند کر رہا تھا اور فاتحانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''حاکم اپنی حاکمیت منوا کر ہی دم لیتا ہے۔ اب تجھے معلوم ہو گا کہ تیرا ایک تھپڑ کتنا مہنگا پڑنے والا ہے؟''

پہلے تو وہ سکتے میں رہ گئی۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بیٹی کہنے والا رُستم اسے اس مقام پر پہنچا دے گا' پھر وہ غصے سے چیخنے چلانے لگی۔ ''دروازہ کھولو۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ میں کہتی ہوں۔ اچھا نہیں ہو گا۔ دروازہ کھول دو۔''

وہ دوڑتی ہوئی ایک کھڑکی کی طرف گئی۔ اسے کھولنا چاہا تو پتا چلا' باہر سے کیلیں ٹھونک کر اسے بند کیا گیا ہے۔ جب تک وہ وہاں سے پلٹتی تب تک جلال اکبر نے آ کر اسے دبوچ لیا۔ ''کیوں چیخ چیخ کر ہلکان ہو رہی ہو؟ یہاں کوئی تمہاری فریاد سننے والا نہیں ہے۔''

وہ اس کی گرفت سے نکلنا چاہتی تھی لیکن شکنجہ بہت مضبوط تھا۔ وہ بے بسی سے روتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟''

''تم میری ضرورت ہو۔ آج کے بعد ضروری نہیں رہو گی۔''

''خدا کے لئے مجھے جانے دو۔ تھپڑ کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو میری جان لے لو۔''

وہ اسے اِدھر اُدھر سے ناپتے تولتے ہوئے بولا۔ ''تم جان دینا چاہتی ہو اور میں یہی لے رہا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد پتا چلے گا کہ تمہاری جان نہیں گئی۔ باقی سب کچھ چلا گیا ہے۔''

اس کے پاس ایک آخری قوت رہ گئی۔ وہ سپارہ اب تک اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا واسطہ...... یہ دیکھو! ہمارے درمیان اللہ کا کلام ہے۔ اس مقدس کتاب کا واسطہ دیتی ہوں۔ مجھے عزت آبرو سے جانے دو۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

وہ ایکدم سے چونک کر اس سے الگ ہو گیا۔ ایک ذرا

لائٹ......کیمرا......ایکشن!

مقدمے نے میڈیا کی کافی توجہ حاصل کر لی تھی۔ اس روز کی کارروائی کی کوریج کے لیے کئی ٹی وی چینلز کے کیمرا مین اور رپورٹرز آئے ہوئے تھے۔ آخر کار جج صاحب بھی آ گئے۔ اپنی نشست پر بیٹھ کر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا ''کیا سب لائٹس وغیرہ ٹھیک ہیں؟''

''یس سر!'' ایک رپورٹر نے جواب دیا۔

''کیا تمام کیمرے درست کام کر رہے ہیں؟'' جج صاحب نے پوچھا۔

''جی ہاں...... جناب والا!'' ایک کیمرا مین نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......تو پھر اب وقت آ گیا ہے کہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں......'' جج صاحب نے سامنے رکھی فائلوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

الجھ کر سپارے کو تکنے لگا۔ وہ سپارے کو چوم کر اسے اپنے سر پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے دل میں ذرا سا بھی خوفِ خدا ہے تو تم مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔“

وہ اس سپارے کو اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے بولا۔ ”بے شک۔ میرے دل میں خوفِ خدا ہے۔ اسے یہاں نہیں ہونا چاہئے۔“

پھر اس کھلے ہوئے سپارے کو طاق پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”اسے دور رہنے دو۔ تم رگِ جاں کے قریب آ جاؤ۔“

اس نے ہاتھ پکڑ کر پھر اسے اپنے شکنجے میں لیتے ہوئے کہا۔ ”ہر چیز کی اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی جگہ پہنچ گیا ہے۔ تم اپنی جگہ آ گئی ہو۔“

جب ہوس غالب آتی ہے تو خدا کے خوف پر شیطنت مسلط ہو جاتی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ قرآن کو وسیلہ بنا کر بھی اس کی فرعونیت سے بچ نہیں پائے گی۔ فرعون نے تو حد کر دی۔ وہ تمام حدوں سے گزرتا چلا گیا۔

وہ سپارہ طاق پر کھلا ہوا تھا۔ جیسے کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ آبرو کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی سپارے کی یہ آیت جیسے ایک ظالم کو تاکید کر رہی تھی۔ ”اور ڈرو اس فتنہ (آزمائش) سے جو صرف انہی پر پڑے گی جو تم میں سے ظالم ہیں۔ اور خوب جان لو اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (سورۃ الانفال)۔“

☆☆☆

اس روز ہاسٹل کی فضا ایسی خاموش اور اداس تھی جیسے کسی انجانے سانحے کا سوگ منا رہی ہو۔ اکرم اپنے روم سے نکل کر راہداری میں آ گیا۔ ریلنگ سے لگ کر نیچے گارڈن میں اور عمارت کے دوسرے حصوں میں طلبا و طالبات کو دیکھنے لگا۔ طبیعت میں عجیب سی بے چینی تھی۔ دل تھا کہ نہ پڑھائی میں لگ رہا تھا، نہ کسی بہانے سے بہل رہا تھا۔

پیچھے سے کسی نے شانے پر ہاتھ مارا تو وہ ایکدم سے چونک گیا۔ پلٹ کر دیکھا، وہاں اس کا جگری دوست شہروز کھڑا ہوا تھا۔ وہ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم کب آئے؟“

شہروز نے کہا۔ ”اس ہاسٹل میں صرف تم سے ملنے آتا ہوں، لہٰذا گاڑی سے اتر کر سیدھا تمہارے پاس ہی پہنچا ہوں۔ تم سناؤ، کیا ہو رہا ہے؟“

وہ بے دلی سے مسکرا کر بولا۔ ”دنیا میں کیا ہو رہا ہے، مجھے علم نہیں... بس اپنی خبر ہے، کل سے طبیعت کچھ بے چین سی ہے۔“

شہروز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے پوچھا۔ ”منگیتر کی یاد آ رہی ہے؟“

وہ تصور میں ثریا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یاد کرنے کے لئے پہلے بھولنا پڑتا ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ہر آتی جاتی سانس اس کی مالا جپتی رہتی ہے۔ تم ہی بتاؤ، سانسوں کی روانی کو بھول کر کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟“

شہروز چٹکی بجا کر اسے متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ ”بس...... منگیتر کا نام لیا اور جناب کا مزاج شاعرانہ ہو گیا۔ یار! میں بھی منگنی شدہ ہوں لیکن میری منگیتر ہر وقت میرے حواس پر چھائی نہیں رہتی۔“

”شاید اس لئے کہ تمہارے درمیان جدائی کا عذاب نہیں ہے؟“

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ”یہ بات تو ہے دوست......! زندگی میں جب تک جدائی نہیں آتی...... محبت میں شدت نہیں آتی۔ ثریا سے کہو اپنے خطوط کی تعداد بڑھا دے۔ مہینے میں ایک خط لکھنے کے بجائے تین لکھ دیا کرے تاکہ یہاں بلاناغہ مریضِ دل کی دوا ہوتی رہے۔“

وہ اس کی بات سن کر مسکرانے لگا۔ شہروز نے کہا۔ ”اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا...... کتنی بار کہا ہے، میرے فلیٹ میں چلو۔ میں بھی تنہا ہوں، تم بھی تنہا ہو۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو...... مگر میری بات ایک کان سے سنتے ہو، دوسرے کان سے اڑا دیتے ہو۔ اس ہاسٹل کی بور فضا بھی تمہاری طبیعت پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ چلو...... کہیں باہر چلتے ہیں۔ دل کے بہلنے کا سامان کرتے ہیں۔“

وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن شہروز نے ضد کی تو انکار نہ کر سکا..... اسی وقت چپڑاسی نے آ کر ایک لفافہ اکرم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کا خط......“

”خط...؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اس لفافے کو دیکھ رہا تھا پھر اچانک ہی اسے جھپٹتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔ ”ثریا......؟“

چپڑاسی وہاں سے چلا گیا۔ شہروز نے حیرت سے کہا۔ ”ابھی دو ہفتے پہلے ہی تو ایک خط آیا تھا۔“

اکرم مارے خوشی کے اس کی پیشانی چوم کر بولا۔ ”یار! تمہاری زبان بڑی مبارک ہے۔ وہاں خط کا نام لیا، یہاں یہ لفافہ میرے ہاتھوں میں آ گیا۔ ثریا نے پہلی بار ایک ماہ میں مجھے یہ دوسرا خط لکھا ہے۔ تھینک یو یار! تھینک یو......“

”اب خوش ہی ہوتے رہو گے یا اسے کھول کر پڑھو گے

بھی......؟"

وہ اس لفافے کو چوم کر سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

"دل کے بہل جانے کا سامان آگیا ہے۔ سوری یار! اب تمہارے ساتھ باہر نہیں جاسکوں گا۔"

"باہر نہ سہی...... کینٹین میں تو چلو۔ وہیں اسے بھی پڑھ لینا۔"

اکرم نے بے چینی سے لفافے کو دیکھا۔ اس کے اندر محبوبہ کی کھٹی میٹھی باتیں چھپی ہوں گی۔ وہ جب بھی اس کا کوئی خط پڑھتا تو جیسے وہ پہلو سے آکر لگ جاتی تھی۔ اس نے کترانے کے انداز میں کہا۔ "تم چلو...... میں بس اسے پڑھ کر آتا ہوں۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ پورا دن گزر جائے گا مگر تمہارا اس تحریر سے دل نہیں بھرے گا۔ ابھی سرسری انداز میں پڑھ لو پھر رات کو بستر پر لیٹ کر صبح تک پڑھتے رہنا۔"

ایک طرف محبت نامہ تھا' دوسری طرف دوست تھا۔ نہ وہ خط کی جان چھوڑ سکتا تھا' نہ شہروز اس کی جان چھوڑنے والا تھا۔ وہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر اس لفافے کو کھولتے ہوئے بولا۔ "تو پھر انتظار کرو۔ ابھی چلتے ہیں۔"

وہ خط کھول کر پڑھنا چاہتا تھا...... مگر چونک گیا۔ شہروز چوروں کی طرح اس کے پیچھے سے جھانک رہا تھا خط پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اکرم نے ایکدم سے پلٹ کر گھورتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

وہ فوراً ہی پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "کچھ نہیں۔ میں خط تو نہیں پڑھ رہا تھا۔ بس یہ دیکھ رہا تھا' تحریر کتنی طویل ہے؟"

"موبائل فون پر تمہاری صبوحی کے مسیج آتے رہتے ہیں۔ کیا تم مجھے دکھاتے ہو' وہ کتنے طویل ہوتے ہیں؟"

وہ پھر اس کی طرف سے منہ پھیر کر خط کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شہروز کچھ دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا پھر موبائل فون نکال کر اپنی منگیتر صبوحی کو مسیج کرنے لگا۔

اکرم سمجھ رہا تھا' خط کی ہر سطر میں پیار کا چٹخارہ ہوگا لیکن جیسے جیسے اسے پڑھتا جا رہا تھا' ویسے ویسے ٹوٹتا جا رہا تھا۔ دل و دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ثریا نے خود پر بیتے ہوئے عذاب کے ایک ایک لمحے کو تحریر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "اکرم! میں تمہاری امانت کی حفاظت نہ کر سکی۔ تمہارے قابل نہ رہی۔ مجھے اپنے آپ سے...... اپنے وجود سے کراہیت محسوس ہونے لگی ہے۔ تمہارا سامنا نہیں کر سکوں گی۔ اس لئے...... اس لئے......"

جیسے لکھنے والی کی سانسیں ٹوٹ رہی تھیں اور اِدھر پڑھنے والے کا دم نکل رہا تھا۔ وہ ریلنگ کا سہارا نہ لیتا تو گر پڑتا۔ "میں نے بہت سوچا' کیا اپنا چہرہ تمہیں دکھانا چاہئے؟ نہیں...... نہ تمہیں' نہ دنیا والوں کو...... جب انسان اپنی ہی نظروں میں گر جائے تو اسے قبر کی چادر میں منہ چھپا لینا چاہئے۔ یہ خط تمہارے ہاتھوں میں پہنچے گا تو میں قبر کی آغوش میں پہنچ چکی ہوں گی۔"

وہ ریلنگ کا سہارا لینے کے باوجود ڈگمگایا پھر سنبھل گیا۔ اس نے آگے لکھا تھا۔ "شہزوروں کی دنیا میں کمزور کیا کر سکتے ہیں۔ جلال اکبر اس قدر بااختیار ہے کہ قانون کے ہاتھوں کو کمزور بنا دیتا ہے۔ اس کے آگے ہم تم سوکھے پتے کی طرح ہیں۔ ایک پھونک سے اُڑ جاتے ہیں۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں......؟ کچھ نہیں۔ میں ایک مشرقی لڑکی اپنی زبان سے اپنے لٹنے کی روداد سب کے سامنے پنچایت میں یا بھری عدالت بیان نہیں کر سکتی۔ کچھ کہنے سے پہلے شرم سے مر جاؤں گی پھر پنچایت بھی چودھری کی ہے اور عدالت بھی اسی نیشنل اسمبلی والے کی ہے۔ انصاف کہاں سے ملے گا......؟

"سنا ہے خدا کے گھر دیر ہے' اندھیر نہیں ہے۔ اگر موت کے بعد میری روح عالمِ برزخ میں رہ کر دیکھ سکے تو میں دیکھوں گی کہ اسی دنیا میں جلال اکبر جیسے ظالم قانون کی گرفت میں آتے ہیں اور سزا پاتے یا نہیں......؟ ابھی تو میری حیا کہتی ہے' کسی کو منہ نہ دکھاؤں۔ اس لئے قیامت تک کے لئے پردہ کر رہی ہوں۔ خدا حافظ میرے محبوب......"

ان الوداعی الفاظ نے جیسے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔ وہ ریلنگ کا سہارا لینے کے باوجود خود کو سنبھال نہ سکا۔ صدمات سے ٹوٹتا ہوا، ڈگمگاتا ہوا زمین پر گرتا چلا گیا۔ شہروز موبائل پر مصروف تھا۔ اسے یوں گرتے دیکھ کر ایکدم سے چونک گیا۔ فوراً ہی آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "اکرم......! کیا ہوا؟ اکرم......!"

وہ جیسے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ خالی خالی نظروں سے اس خط کو تک رہا تھا۔ شہروز اس کے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "سب خیر تو ہے؟ کیا لکھا ہے ثریا نے......؟"

وہ شکستہ لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔ "میں جسے محبت نامہ سمجھ رہا تھا' وہ اجل نامہ نکلا......"

اس نے وہ کاغذ شہروز کی طرف بڑھا دیا۔ وہ فوراً ہی اسے لے کر پڑھنے لگا۔ اکرم دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو نوچ رہا تھا۔ سر کو پیچھے ریلنگ سے ٹکراتے ہوئے بولا۔

"ثریا......!"

شہروز نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر بڑے دکھ سے کہا۔ "مائی گاڈ! یہ سب کیا ہو گیا؟"

اکرم پر صدمات کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ جسے جانِ حیات کہتا تھا' وہ اچانک ہی اس کی حیات سے یوں چلی گئی تھی جیسے ایک لمحہ آ کر گزر گیا ہو۔ شہروز اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ "خدا کے لئے دوست! کہہ دو کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ مری نہیں ہے۔ زندہ ہے۔ میری ثریا مری نہیں ہے......"

شہروز اس خط کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ واقعی مری نہیں ہے۔ اسے مرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ یہ جلال اکبر تمہارے علاقے کا چودھری ہے نا......؟"

اس کا نام سن کر اکرم کے اندر آگ سی بھر گئی۔ وہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "جلال اکبر...... ہاں۔ اس بھیڑیے نے ثریا کو مرنے پر مجبور کیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... اس کا کفن میلا ہونے سے پہلے جلال کو کفن پہنادوں گا۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا ایک طرف جانے لگا۔ شہروز اسے بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے بولا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

وہ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بولا۔ "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... اس کا خون پی جاؤں گا۔"

"وہ علاقے کا چودھری ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ ایم این اے ہے۔ جب بھی اس کی پارٹی اقتدار میں آتی ہے' اسے کسی نہ کسی شعبے کی وزارت ضرور ملتی ہے۔ ایسے لوگ مگرمچھ ہوتے ہیں۔ ہم جیسی چھوٹی مچھلیوں کو نگل لیتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں لیتے۔"

"تم کیا چاہتے ہو' میں اپنی ثریا کا بدلہ نہ لوں؟ اس درندے کو زندہ چھوڑ دوں؟"

"بدلہ تو لینا ہے مگر ایسے نہیں جیسے تم چاہتے ہو۔ حویلی میں جا کر شور مچاؤ گے' چودھری سے انتقام لینا چاہو گے تو اس سے پہلے ہی وہاں کے محافظ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ یوں جوش میں آ کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے تو پھر انتقام کا جذبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا؟"

وہ بے بسی سے اپنے بالوں کو نوچتے ہوئے بولا۔ "تو پھر میں کیا کروں؟"

"صبوحی کے والد آئی جی پولیس ہیں۔ وہ ہماری مدد کریں گے۔ اسے قانونی طور پر سزا دلوائیں گے۔"

[illegible] میں پڑھا ہے' ڈراموں اور فلموں میں دیکھا ہے۔ جلال جیسے فرعون کبھی قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔ ایسے فرعونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے موسیٰ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"فی الحال انکل کے پاس چلو۔ وہ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ہی وہ آئی جی آف پولیس رانا مجید کے آفس میں پہنچ گئے۔ وہ تمام رُوداد سننے کے بعد اکرم سے بولا۔ "میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔ بے شک۔ جلال اکبر جیسے درندے کو سزا ملنی چاہئے مگر......"

شہروز نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "مگر کیا انکل! کیا قانونی چارہ جوئی میں بھی اگر مگر کی گنجائش ہوتی ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں' وہاں قانون برائے نام رہ گیا ہے۔ تم نے سنا ہوگا' قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں لیکن یہ ہاتھ جلال اکبر جیسے بڑے اور اونچے لوگوں تک پہنچتے پہنچتے بہت ہی چھوٹے ہو جاتے ہیں۔"

اکرم نے بے چینی سے پہلو بدل کر شہروز کو دیکھا۔ وہ ثریا کا خط رانا مجید کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "اس کے خلاف یہ تحریری ثبوت ہمارے پاس ہے۔ کیا اس کے باوجود وہ مجرم قانون کی گرفت میں نہیں آ سکے گا؟"

وہ اس خط کو پڑھنے کے بعد بولا۔ "یہ بہت ہی ٹھوس ثبوت ہے مگر تم سیاسی ہتھکنڈوں کو نہیں جانتے۔ جلال اکبر برسرِ اقتدار ہے۔ اس ثبوت کے باعث ہاتھ تو آئے گا لیکن ریت کی طرح مٹھی سے نکل جائے گا۔ اور دشمنی کے طور پر میرا ٹرانسفر کرا دے گا۔ ایسی عارضی کامیابی کا نقصان یہ بھی ہوگا کہ اکرم اس کی نظروں میں آ جائے گا۔"

"تو پھر آپ ہی بتائیں' ہم کیا کریں؟"

اکرم نے کہا۔ "جب تک وہ زندہ رہے گا' مجھے چین نہیں آئے گا۔"

رانا مجید کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے کے انداز میں اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے بولا۔ "جلال اکبر جیسے شہزور کو سزا دلوانے کے لئے یہ تحریری ثبوت ناکافی ہے۔ ہمیں اس کے خلاف مزید ٹھوس ثبوت جمع کرنے ہوں گے۔"

پھر وہ اکرم کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "وہ مظلوم اس دنیا سے چلی گئی۔ فی الحال ہم اس کی موت پر آنسو بہا سکتے ہیں۔ اس ظالم کو فوراً ہی گرفت میں نہیں لے

سکتے۔ اس کارروائی میں تھوڑا وقت لگے گا۔"

شہروز نے کہا۔ "انکل! یہ تعزیت کے لئے ثریا کے گھر جانا چاہتا ہے۔ میں تو سمجھا ہی رہا ہوں، آپ بھی سمجھائیں۔ وہاں جلال اکبر کو دیکھ کر طیش میں نہ آئے۔ اپنی کسی حرکت سے ظاہر نہ کرے کہ یہ ثریا کی خودکشی کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔"

رانا مجید نے کہا۔ "ہاں۔ اکرم! تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ بلکہ میرا مشورہ مانو تو فی الحال وہاں نہ جاؤ۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں انکل! جب سے خط ملا ہے، مجھے کہیں چین نہیں آ رہا ہے۔ اس کی قبر پر جاؤں گا...... فاتحہ پڑھوں گا تو شاید......"

اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رومال سے آنسو پونچھنے لگا۔ شہروز اور رانا مجید اسے تسلیاں دینے لگے۔ محبوبہ سے دائمی جدائی کا صدمہ ایسا تھا کہ ان کی تسلیاں اور دلاسے پھیکے پڑ رہے تھے۔

☆☆☆

شہرِ خموشاں کے پُراثر سناٹے میں موت اٹل حقیقت کی طرح حواسوں پر چھانے لگتی ہے۔ دل و دماغ میں ایک ہی بات گونجنے لگتی ہے "کل نفس ذائقۃ الموت......"

ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے لیکن بعض حالات میں مجبوراً جان سے جانا پڑتا ہے۔ ثریا کو بھی اس کے بدترین حالات نے مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اپنی طبعی عمر کا گلا گھونٹ کر قبر کی تاریکیوں میں منہ چھپا لیا تھا۔

اکرم سر جھکائے قبر کے سرہانے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کی مٹی کو ایک ہاتھ سے یوں سہلا رہا تھا جیسے ابدی نیند سونے والی کو تھپک رہا ہو۔ وہ منوں مٹی تلے خاموش تھی لیکن اس کے کانوں میں بول رہی تھی۔ "یہ کلی تمہارے آنگن میں پھول کی طرح کھلنے والی تھی لیکن...... بدترین حالات کے تھپیڑوں نے اسے مٹی میں ملا دیا۔"

اس کا رینگتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ قبر کی مٹی میں پنجے کی طرح پیوست ہوتا چلا گیا۔ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "میں تو طبعی عمر لے کر آئی تھی لیکن وقت سے پہلے خاک ہو گئی۔ کیا مجھ پر ڈھائے گئے ظلم کا حساب نہیں لو گے؟ آبرو باختہ کہلانے کے بعد تمہارے گلے نہیں لگنا چاہتی تھی، اس لئے موت کو گلے لگا لیا۔ تمہارے لئے جی رہی تھی، تمہارے لئے مر گئی...... کیا ہماری خوشیوں کو ماتم بنانے والے کی شہ رگ تک پہنچنا مشکل ہے......؟ زورِ بازو سے یا ذہانت سے ناممکن...... ممکن ہو جاتا ہے......"

وہ قبر کی مٹی کو مٹھی میں جکڑ کر گہری سنجیدگی سے ایک طرف دیکھنے لگا۔ اس قبرستان کی چاردیواری کے باہر جلال اکبر کے باپ پیر چودھری لیاقت اکبر کا شاندار مزار دور سے جگمگا رہا تھا۔ سفید قیمتی سنگِ مرمر دھوپ میں چمک رہا تھا۔ جلال اکبر ہر جمعرات اپنے ماتحتوں کے ساتھ وہاں حاضری دینے آتا تھا۔

اس مزار کی جگمگاہٹ اور شان و شوکت اکرم کے احساسات میں چبھ رہی تھی۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر قبرستان کی چاردیواری سے نکل کر اُدھر جانے لگا۔ ایسے ہی وقت مزار کے سامنے جلال اکبر کی گاڑی آ کر رکی۔ وہ اپنے باڈی گارڈز اور ماتحتوں کے ساتھ بڑے شاہانہ انداز میں گاڑی سے اترنے لگا۔

اکرم اپنی ثریا کی قبر سے وہاں تک اس طرح چلتا آیا تھا جیسے میلوں دور سے قاتل کا پیچھا کرتا آیا ہو۔ وہ غصے سے ہانپتے ہوئے، گھورتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ سینے میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر مزید بھڑک اٹھی۔ آئی جی رانا مجید کی طرف سے مایوسی مل رہی تھی۔ اس نے فی الحال کوئی حوصلہ افزا بات نہیں کہی تھی۔ بلکہ صاف طور پر اپنی بے بسی ظاہر کر دی تھی کہ جلال اکبر کو سزا دلوانا آسان نہیں ہے۔ اس کے خلاف کارروائی کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔

قانون کے ایک بڑے محافظ کی بے بسی اکرم کے دماغ میں پتھر کی طرح لگ رہی تھی۔ اس نے جھک کر زمین پر سے دو پتھر اٹھا لئے۔ انتقامی جذبہ حواس پر چھا جائے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سامنے والا زورآور ہے۔

وہ بھی ان لمحات میں یہ بھول گیا تھا کہ جلال اکبر کے خلاف کوئی قدم اٹھائے گا تو اس کے گن مین اسے گولیوں سے چھلنی کرنے میں...... ذرا دیر نہیں لگائیں گے۔

وہ ایکدم سے دوڑتا ہوا اس کی طرف جانے لگا۔ اس وقت نظریں چودھری کے سر پر جمی ہوئی تھیں۔ ذرا فاصلے پر پہنچ کر اس نے مٹھی میں دبے ہوئے پتھر کو پوری قوت سے اس کی طرف دے مارا۔ وہ پکا نشانے باز نہیں تھا۔ ہاتھ ایک ذرا بہکا، نشانہ خطا ہو گیا۔ وہ پتھر سر کے بجائے اس کے شانے کو زخمی کرتا چلا گیا۔ اس کے منہ سے ایک کراہ نکلی۔ دائیں بائیں چلنے والے ماتحت اور گن مین ایکدم سے الرٹ ہو گئے۔

اکرم حواس باختہ سا ہو کر چلانے لگا۔ "میں...... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا چودھری......! تیری درندگی نے

میری ثریا کو مار ڈالا ہے...... میں ...... میں تیرا خون پی جاؤں گا......"

وہ دوسرا پتھر مارنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی پورے وجود میں جیسے آگ سی بھر گئی۔ ایک سنسناتی ہوئی گولی بازو میں سوراخ کرتی چلی گئی تھی۔ وہ خود کو سنبھالنا چاہتا تھا مگر دوسری اور پھر تیسری گولی نے موقع نہ دیا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ ایک ذرا تڑپ کر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔

جلال اکبر اس کے مردہ وجود کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ اس نے پتھر مارتے ہوئے ثریا کا نام لیا تھا۔ چودھری کو یاد آیا کہ وہ اس کا منگیتر تھا۔ خودکشی کرنے والی نے اپنے لٹنے کی روداد اس کے کانوں تک پہنچا دی تھی۔ تب ہی وہ کتے کی طرح یہاں کاٹنے آیا تھا۔

اس نے حقارت سے اس کی لاش کی طرف دیکھا۔ پھر نفرت سے اُدھر تھوکتے ہوئے مزار کے اندر چلا گیا۔

بے شک! ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے
مگر خدا جلال اکبر جیسے شیطانوں کی عمر ذرا طویل رکھتا ہے
تاکہ وہ جی بھر کر اپنے نامہ اعمال کو سیاہ کرتے چلے جائیں۔
اکثر خدا کی قدرت انسانی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔

☆☆☆

رانا مجید نے اپنی اسٹک کو میز پر پٹختے ہوئے کہا۔ "شٹ... اس لڑکے نے یہ کیا کیا؟ کتنا سمجھایا تھا' اُس پہاڑ سے ٹکرانا بچوں کا کھیل نہیں ہے اور وہ...... ہتھیار کے بغیر اسے توڑنے چلا تھا؟ بے وقوفی کی انتہا ہے۔"

شہروز سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا۔ عزیز دوست کی موت کا صدمہ بڑا تکلیف دہ تھا۔ صبوحی نے کہا۔ "یہ تو وہی بات ہو گئی کہ سانپ نہیں مرا اور لاٹھی ٹوٹ گئی۔" پھر وہ شہروز کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "تم نے اسے وہاں جانے ہی کیوں دیا تھا؟"

وہ بولا۔ "وہ منگیتر کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا' اپنی موت کو دعوت دینے جا رہا ہے؟"

رانا مجید نے سر جھٹک کر کہا۔ "میں نے جلال اکبر کو گرفت میں لینے کے لئے ٹھوس پلاننگ کی تھی۔ مگر......"

شہروز بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔ "مگر کیا انکل! میرے دوست کا دشمن میرا دشمن ہے۔ اکرم نہیں رہا تو کیا ہوا؟ آپ اپنی پلاننگ مجھے بتائیں۔ میں جلال اکبر کو جہنم میں پہنچاؤں گا۔"

صبوحی نے پریشان ہو کر باپ کو دیکھا پھر شہروز کا بازو

[illegible] کام کر رہا [illegible] تم اس معاملے سے دور رہو۔ وہ خطرناک لوگ ہیں۔ خدانخواستہ......"

باپ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ڈونٹ وری مائی چائلڈ! میں نے اس شہزور کو کمزور بنانے کے لئے ایک زبردست پلاننگ کی ہے۔ وہ ہمارے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

وہ احتجاج کرنے کے انداز میں بولی۔ "وہ کھلی غنڈا گردی کرتا پھر رہا ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ آپ قانون کے محافظ ہیں پھر اس کے خلاف ثریا کا تحریری ثبوت رکھتے ہوئے بھی اتنے بے بس کیوں ہیں؟"

"بیٹی! تم نہیں سمجھو گی۔ قانون ان بڑے لوگوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے۔ جلال اکبر کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود کوئی اس پر انگلی اٹھانے کی یا اسے مجرم کہنے کی جرات نہیں کر سکتا مگر میں کروں گا۔"

شہروز نے پُرتجسس انداز میں پوچھا۔ "وہ پلاننگ کیا ہے؟"

"چودھری جلال اکبر کے جرائم کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر آج تک اس کے کرتوت کی لسٹ تیار نہیں ہو سکی ہے۔ وہ سیاسی بازی گر ہے۔"

"یعنی آپ لوگوں کے پاس اس کے کسی ایک جرم کا بھی ریکارڈ موجود نہیں ہے؟"

"بالکل...... ثریا کا یہ خط اس کے خلاف پہلا ٹھوس ثبوت ہے۔ مگر ایک ثبوت سے کیا ہوتا ہے؟ میں تو اس کے کارناموں کی کانفیڈنشل فائل تیار کرنا چاہتا ہوں۔ تم میری ہدایت کے مطابق اس کے خلاف کارروائی کرو گے۔"

وہ بڑی خاموشی سے اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بولا۔ "میں اس کے تمام جرائم اسی کے منہ سے اگلوانا چاہتا ہوں۔"

صبوحی نے کہا۔ "ڈیڈی! آپ ناممکن کو ممکن بنانے کی بات کر رہے ہیں۔ جب وہ آپ کے ہاتھ نہیں آتا ہے' کسی جرم میں پکڑا نہیں جاتا ہے تو اس سے اقبال جرم کیسے کرایا جائے گا؟"

"طریقے آتے ہوں تو کوئی بات ناممکن نہیں رہتی۔"

شہروز نے پہلو بدل کر پوچھا۔ "اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

رانا مجید نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "چودھری جلال اکبر کو کڈنیپ کرنا ہے۔"

صبوحی نے ایکدم سے چونک کر باپ کو دیکھا پھر

پریشان ہوکر کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ جلال اکبر بہت خطرناک شخص ہے۔ وسیع اختیارات کا مالک ہے۔ کیا اسے اغوا کرنا آسان ہوگا؟ پلیز ڈیڈ! شہروز کو اس معاملے سے دور رکھیں۔ آج یہ اس کے خلاف قدم اٹھائے گا تو کل وہ بھی انتقامی کارروائی کرسکتا ہے۔"

شہروز نے کہا۔ "تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ انکل کا ہاتھ میرے سر پر رہے گا۔"

رانا مجید نے اس کی تائید میں کہا۔ "بے شک میں درپردہ تمہیں بھرپور تحفظ دیتا رہوں گا۔"

صبوحی نے پہلو بدل کر کہا۔ "پھر بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

چودھری جلال اکبر کو اغوا کرنا آسان نہیں تھا۔ شہروز رانا مجید کی ہدایت کے مطابق مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

جلال اکبر اپنے وسیع وعریض ڈرائنگ روم میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اکرم کے قتل کے بعد کچھ بے چین سا تھا۔ یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ ثریا کے ساتھ یہاں جو کچھ ہوا اس کی خبر اکرم تک کیسے پہنچی؟ کس نے پہنچائی؟

اس نے اپنے پرسنل سیکریٹری کے ذریعے معلومات حاصل کی تھیں۔ اس نے فون پر رپورٹ دی تھی کہ ثریا خط و کتابت کے ذریعے اکرم سے رابطہ رکھتی تھی۔ خودکشی سے پہلے بھی اس نے اپنے منگیتر کے نام ایک خط پوسٹ کیا تھا۔

رستم اس کے سامنے حاضر ہوکر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "آپ نے مجھے یاد کیا ہے سرکار.....؟"

وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ غرا کر بولا۔ "تم سب نکمے ہو گئے ہو۔ مفت کی روٹیاں توڑتے ہو۔ علاقے میں کہاں کیا ہوتا رہتا ہے، تمہیں خبر نہیں ہوتی۔"

وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ "کوئی غلطی ہو گئی سرکار......!"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا دعویٰ ہے کہ علاقے کے ایک ایک بندے پر کڑی نظر رکھتے ہو؟ پھر یہ خبر کیوں نہ ہوسکی کہ وہ خودکشی کرنے والی...... کیا نام تھا اس کا......؟"

"ثریا......"

"ہاں ثریا...... وہ اپنے یار کو خط لکھتی رہتی تھی۔ تم نے کبھی مجھ سے اس بات کا ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"ربّ جانتا ہے سرکار! مجھے کچھ خبر نہیں۔"

وہ غصے سے بولا۔ "یہی تو پوچھ رہا ہوں، تمہیں خبر کیوں نہیں ہے؟ تمہاری یہ نااہلی مجھے مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔ ابھی میرے پی اے نے بتایا ہے، اس لڑکی نے خودکشی سے پہلے اکرم کو خط لکھا تھا۔ یقیناً میرے خلاف زہر اگلا ہوگا۔ تب ہی اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی جرات کی تھی۔"

"لیکن سرکار! وہ دونوں مر چکے ہیں۔ اپنا قصہ اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں۔ اب کیا پریشانی ہے؟"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "پریشانی وہ خط ہے۔ پتا نہیں اکرم نے اسے کہاں رکھا ہوگا؟ وہ کسی کے ہاتھ لگ گیا تو میری بڑی بدنامی ہوگی۔ تم اسٹوڈنٹس کو نہیں جانتے۔ انہیں لیڈروں کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگانے اور پتھراؤ کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

وہ ٹہلنے کے انداز میں اِدھر سے اُدھر جانے لگا۔ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "غصہ تو مجھے تم پر آرہا ہے۔ تمہاری نااہلی نے کام خراب کیا ہے۔ اگر مجھے ایک ذرا بھی شبہ ہوتا کہ ثریا نے اسے خط لکھا ہوگا تو پہلے میں اس خط کو حاصل کرتا پھر اسے جہنم رسید کرتا۔ پتا نہیں میرے خلاف وہ ثبوت اس وقت کس کے ہاتھوں میں ہوگا؟"

رستم نے کہا۔ "وہ ضرور اس کے باپ کے پاس ہوگا۔"

"وہ خط اسے ہاسٹل میں ملا تھا۔ پتا نہیں وہ اسے اپنے ساتھ یہاں لایا بھی تھا یا وہیں چھوڑ آیا ہے؟ اگر اس کے باپ کے پاس ہوگا تو وہ اتنا جی دار نہیں ہے کہ مجھ سے ٹکر لے یا میرے خلاف کوئی کارروائی کرے لیکن پھر بھی میں اپنی تسلی کے لئے اس خط کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"میرا حقیر مشورہ مانیں سرکار! ابھی اکرم کے باپ کو بلائیں اگر وہ خط کو چھپا رہا ہوگا تو چمڑی ادھڑنے کے خوف سے فوراً اسے آپ کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔"

وہ قائل ہونے کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "ہوں...... فٹافٹ کسی بندے کو بھیجو اور پانچ منٹ میں اکرم کے باپ کو میرے سامنے حاضر کرو۔"

وہ حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تو اکرم کا باپ اس کے ساتھ تھا۔ جلال اکبر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "سنا ہے تم اپنے بیٹے کے قاتلوں کا سراغ لگاتے پھر رہے ہو؟"

رانا مجید کے مشورے کے مطابق اکرم نے اپنے گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ خط کا بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے باپ نے چودھری کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑی عاجزی سے کہا۔ "میں حقیر بندہ آپ کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا

سرکار.....! جوان بیٹے کی موت نے میری کمر توڑ دی ہے۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ میرے لئے کچھ کریں۔ ان قاتلوں کو پکڑ کر سزا دلوائیں۔''

وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''میں تو کوشش کر ہی رہا ہوں مگر تمہارا تعاون بھی ضروری ہے۔ یہ بتاؤ' اکرم کی کتابوں میں یا اس کے سامان میں ثریا کا لکھا ہوا کوئی خط ہے؟''

وہ بولا۔ ''اس کی کتابیں اور اس کا تمام سامان ہاسٹل میں ہی ہے۔ میں تو صدمے سے ایسا ٹوٹا ہوں کہ وہاں سے اس کا سامان تک لانے نہیں گیا۔''

جلال اکبر نے کہا۔ ''اتنا تو ہم جانتے ہیں' اس کی لاش پہلے پوسٹ مارٹم کے لئے گئی تھی پھر گھر آئی تھی۔ تمہارے بیٹے کی لاش سے کچھ تو نکلا ہوگا؟ تھانیدار نے تمہیں کچھ تو دیا ہوگا؟''

''اس کا شناختی کارڈ اور ایک پرس دیا تھا۔''

جلال اکبر سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ''بعد میں تم نے چیک کیا' اس پرس میں کیا کیا تھا؟''

''ماسٹر امام دین نے اسے میرے سامنے کھولا تھا۔ اس پرس میں اس کے تعلیمی کاغذات اور پچاس روپے رکھے ہوئے تھے۔''

''یاد کرو' کوئی ایسا کاغذ جسے امام دین نے اپنے پاس رکھ لیا ہو؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں جی! وہ پرس جوں کا توں میرے پاس ہے۔''

وہ اسے ہزار کا ایک نوٹ دیتے ہوئے بولا۔ ''تم ابھی بیٹے کے ہاسٹل جاؤ اور اس کا تمام سامان میرے پاس لے آؤ۔ ممکن ہے اس کے قاتلوں کا سراغ لگا سکیں۔''

وہ رقم لے کر سلام کرتا ہوا چلا گیا۔ جلال اکبر کے دماغ میں تھانیدار کا نام گھوم رہا تھا۔ اس نے اکرم کے باپ کو رخصت کرتے ہی فون پر اس سے رابطہ کر کے کہا۔ ''ہیلو! میں چودھری جلال اکبر بول رہا ہوں۔''

تھانیدار کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''میں تو حضور کو فون کی گھنٹی سے پہچان لیتا ہوں' حکم کریں مائی باپ.....!''

''تم کچھ زیادہ ہی سیانے ہوتے جا رہے ہو۔ اس روز اکرم کے جسم سے نکلی ہوئی گولیوں کو دیکھ کر فوراً ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ میرا شکار تھا۔'' وہ خاموش رہا تو چودھری نے کہا۔ ''ویسے میں بھی اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہوں۔ سیدھی طرح بتادو' مقتول کے پرس سے تم نے کیا کیا برآمد کیا تھا؟''

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''غریب کے پرس میں کیا ہو سکتا تھا جناب! خدا جانتا ہے' کل نقدی ڈیڑھ سو روپے تھی۔ جیسی چاہے قسم لے لیں۔ اس ناچیز نے صرف سو روپے لئے ہیں۔''

''رقم کے علاوہ اور کیا کیا تھا؟ میرا مطلب ہے' کوئی خط وغیرہ.....؟''

''خط.....؟ نہیں سرکار! پرس میں صرف تعلیمی کاغذات تھے اور شناختی کارڈ تھا۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق وہ کیس رفع دفع کر دیا ہے۔ کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟''

وہ پہلو بدل کر بولا۔ ''نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے اگر ہوا تو میں فون کروں گا۔''

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ رستم ایک طرف کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''چودھری جی! دماغ پر بوجھ نہ لیں اگر وہ خط کسی کے ہاتھ لگا ہوتا تو اب تک یہاں خبر پہنچ چکی ہوتی۔ ثریا کی موت کے بعد اکرم کے قتل کو بھی پانچ روز گزر چکے ہیں۔ ہم جیسے کی کمین کیڑے مکوڑوں کی طرح مرتے ہی رہتے ہیں۔ کون پوچھنے آتا ہے؟''

وہ قائل ہونے کے انداز میں سر ہلانے لگا پھر بولا۔ ''اب تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ 'ہوگا' دیکھا جائے گا۔ ویسے یہ ساری الجھن تمہاری وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ نہ تم بے خبر رہتے' نہ وہ خودکشی کرنے والی اپنے یار کو خبر کرتی۔ آگے دیکھتے ہیں' ہاسٹل سے لائے ہوئے سامان سے کیا نکلتا ہے؟''

جلال اکبر نہیں جانتا تھا کہ اس خط کو کیسے پر لگ گئے ہیں؟ وہ اس کے علاقے سے اڑتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

شہروز رانا مجید کے تعاون سے جلال اکبر کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر رہا تھا۔ وہ لامحدود اختیارات رکھنے والا ہر وقت مسلح گارڈز کی پناہ میں رہتا تھا۔ ایسے عقابی پہریداروں کی موجودگی میں اسے اغوا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن ناممکن نظر آنے والا کام بھی ذہانت سے ممکن ہو جاتا ہے۔

جلال اکبر ظہر یا عشا کی نماز چاہے نہ پڑھتا ہو لیکن سیاسی ظہرانوں اور عشائیوں میں شرکت ضرور کرتا تھا کیونکہ ایسے ظہرانے اور عشائیے سیاسی روابط اور معاملات کو مستحکم بناتے ہیں۔

اس رات بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں عشائیہ اپنے اختتام کو

سرکار.....! جوان بیٹے کی موت نے میری کمر توڑ دی ہے۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ میرے لئے کچھ کریں۔ ان قاتلوں کو پکڑ کر سزا دلوائیں۔''

وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''میں تو کوشش کر ہی رہا ہوں مگر تمہارا تعاون بھی ضروری ہے۔ یہ بتاؤ' اکرم کی کتابوں میں یا اس کے سامان میں ثریا کا لکھا ہوا کوئی خط ہے؟''

وہ بولا۔ ''اس کی کتابیں اور اس کا تمام سامان ہاسٹل میں ہی ہے۔ میں تو صدمے سے ایسا ٹوٹا ہوں کہ وہاں سے اس کا سامان تک لانے نہیں گیا۔''

جلال اکبر نے کہا۔ ''اتنا تو ہم جانتے ہیں' اس کی لاش پہلے پوسٹ مارٹم کے لئے گئی تھی پھر گھر آئی تھی۔ تمہارے بیٹے کی لاش سے کچھ تو نکلا ہوگا؟ تھانیدار نے تمہیں کچھ تو دیا ہوگا؟''

''اس کا شناختی کارڈ اور ایک پرس دیا تھا۔''

جلال اکبر سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ''بعد میں تم نے چیک کیا' اس پرس میں کیا کیا تھا؟''

''ماسٹر امام دین نے اسے میرے سامنے کھولا تھا۔ اس پرس میں اس کے تعلیمی کاغذات اور پچاس روپے رکھے ہوئے تھے۔''

''یاد کرو' کوئی ایسا کاغذ جسے امام دین نے اپنے پاس رکھ لیا ہو؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں جی! وہ پرس جوں کا توں میرے پاس ہے۔''

وہ اسے ہزار کا ایک نوٹ دیتے ہوئے بولا۔ ''تم ابھی بیٹے کے ہاسٹل جاؤ اور اس کا تمام سامان میرے پاس لے آؤ۔ ممکن ہے اس کے قاتلوں کا سراغ لگا سکیں۔''

وہ رقم لے کر سلام کرتا ہوا چلا گیا۔ جلال اکبر کے دماغ میں تھانیدار کا نام گھوم رہا تھا۔ اس نے اکرم کے باپ کو رخصت کرتے ہی فون پر اس سے رابطہ کر کے کہا۔ ''ہیلو! میں چودھری جلال اکبر بول رہا ہوں۔''

تھانیدار کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''میں تو حضور کو فون کی گھنٹی سے پہچان لیتا ہوں' حکم کریں مائی باپ.....!''

''تم کچھ زیادہ ہی سیانے ہوتے جا رہے ہو۔ اس روز اکرم کے جسم سے نکلی ہوئی گولیوں کو دیکھ کر فوراً ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ میرا شکار تھا۔'' وہ خاموش رہا تو چودھری نے کہا۔ ''ویسے میں بھی اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہوں۔ سیدھی طرح بتا دو' مقتول کے پرس سے تم نے کیا کیا برآمد کیا تھا؟''

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''غریب کے پرس میں کیا ہو سکتا تھا جناب! خدا جانتا ہے' کل نقدی ڈیڑھ سو روپے تھی۔ جیسی چاہے قسم لے لیں۔ اس ناچیز نے صرف سو روپے لئے ہیں۔''

''رقم کے علاوہ اور کیا کیا تھا؟ میرا مطلب ہے' کوئی خط وغیرہ......؟''

''خط.....؟ نہیں سرکار! پرس میں صرف تعلیمی کاغذات تھے اور شناختی کارڈ تھا۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق وہ کیس رفع دفع کر دیا ہے۔ کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟''

وہ پہلو بدل کر بولا۔ ''نہیں' کوئی مسئلہ نہیں ہے اگر ہوا تو میں فون کروں گا۔''

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ رستم ایک طرف کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''چودھری جی! دماغ پر بوجھ نہ لیں اگر وہ خط کسی کے ہاتھ لگا ہوتا تو اب تک یہاں خبر پہنچ چکی ہوتی۔ ثریا کی موت کے بعد اکرم کے قتل کو بھی پانچ روز گزر چکے ہیں۔ ہم جیسے کمی کمین کیڑے مکوڑوں کی طرح مرتے ہی رہتے ہیں۔ کون پوچھنے آتا ہے؟''

وہ قائل ہونے کے انداز میں سر ہلانے لگا پھر بولا۔ ''اب تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ 'جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ ویسے یہ ساری الجھن تمہاری وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ نہ تم بے خبر رہتے' نہ وہ خودکشی کرنے والی اپنے یار کو خبر کرتی۔ آگے دیکھتے ہیں' ہاسٹل سے لائے ہوئے سامان سے کیا نکلتا ہے؟''

جلال اکبر نہیں جانتا تھا کہ اس خط کو کیسے پر لگ گئے ہیں؟ وہ اس کے علاقے سے اڑتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

شہروز رانا مجید کے تعاون سے جلال اکبر کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر رہا تھا۔ وہ لامحدود اختیارات رکھنے والا ہر وقت مسلح گارڈز کی پناہ میں رہتا تھا۔ ایسے عقابی پہریداروں کی موجودگی میں اسے اغوا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن ناممکن نظر آنے والا کام بھی ذہانت سے ممکن ہو جاتا ہے۔

جلال اکبر ظہر یا عشا کی نماز چاہے نہ پڑھتا ہو لیکن سیاسی ظہرانوں اور عشائیوں میں شرکت ضرور کرتا تھا کیونکہ ایسے ظہرانے اور عشائیے سیاسی روابط اور معاملات کو مستحکم بناتے ہیں۔

اس رات بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں عشائیہ اپنے اختتام کو

شہر میں آئی ہوں۔ اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوں۔ آج جانے والی تھی لیکن......"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ جلال نے پوچھا۔ "لیکن کیا......؟"

"یہاں کی تقریب میں آپ کی شرکت کا سنا تو رک گئی۔ میری سیٹ او کے ہو چکی تھی۔ میں نے اسے کینسل کرادی۔"

وہ پرس میں سے ٹکٹ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے بولی۔ "لیں۔ یہ دیکھیں...... میں نے کل کی سیٹ کروالی ہے۔"

جلال اکبر تو ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایک نوخیز دوشیزہ اسے ایسی دیوانگی سے چاہتی ہے۔ اس نے پوچھا۔ "تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

"میرا نام خوشبو ہے۔"

"بہت خوبصورت نام ہے۔ واقعی تم خوشبو کی طرح میرے دل و دماغ کو معطر کر رہی ہو۔"

خوشبو نے ایکدم سے جھینپ کر مسلح گارڈز کو دیکھا پھر دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ لوگ سن رہے ہیں۔"

اس نے گارڈز کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "ان کی پروانہ کرو۔ یہ ہمارے حکم کے مطابق سنتے ہیں' بولتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ یوں سمجھو ہمارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

وہ اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ میں کچھ اَن ایزی فیل کر رہی ہوں۔"

اس نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں انہیں دور کر دیتا ہوں۔"

وہ ایک ذرا شرما کر بہت ہی دھیمی آواز میں بولی۔ "اس ہوٹل کے تھرڈ فلور پر میرا روم ہے۔"

جلال اکبر کے لہو کی گردش ایکدم سے تیز ہو گئی۔ جی میں آیا کہ ابھی اس خوشبو کو تھرڈ فلور پر لے اڑے۔ جلال اکبر کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "اب تک رنگ برنگی تتلیوں کو جبرا اپنی مٹھی میں قید کرتا رہا ہوں۔ ان کے رنگ چراتا رہا ہوں۔ آج پہلی بار تیری جیسی خوشبو بڑے آرام سے ہاتھ لگ رہی ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "لیں۔ آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "کچھ نہیں۔ چلو۔ تمہارے کمرے میں چلتے ہیں۔ لیکن میں اپنے گارڈز کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔"

خوشبو نے ٹھٹک کر اسے دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ "یہ کمرے سے باہر رہیں گے۔ ہماری تنہائی میں مداخلت نہیں کریں گے۔"

وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ پھر لفٹ کے ذریعے ہوٹل کے تھرڈ فلور پر آ گئے۔ جلال اکبر اسے ناپتی تولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان لمحات میں ایسا لگ رہا تھا جیسے مال غنیمت ہاتھ آ رہا ہو۔ لابی سے لفٹ تک اور لفٹ سے کمرے تک اس کی نگاہیں صرف خوشبو کا طواف کرتی رہی تھیں۔

وہ کمرے کے دروازے کو کھول کر دعوت دینے کے انداز میں بولی۔ "آیئے۔ سر......!"

وہ اپنے گارڈز کو مستعد اور چوکنا رہنے کی ہدایت کرتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس کی تو جیسے لاٹری نکل آئی تھی۔ خوشبو جیسی بھرپور حسینہ اس کا ایسا دم بھر رہی تھی' ایسی دیوانگی ظاہر کر رہی تھی' جیسے وہ گلفام ہے اور کوہ قاف سے سیدھا اس کے پاس چلا آیا ہے

وہ دونوں ایک صوفے پر آ گئے۔ تنہائی ملتے ہی جلال اکبر کے تیور بدلنے لگے۔ لوہا مقناطیس کی طرف کھنچنے لگا۔ وہ قریب آنے لگا تو وہ دور جانے لگی۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "میرا نام خوشبو ہے اور خوشبو کبھی ہاتھ نہیں آتی سر......!"

وہ مسکرا کر بولا۔ "جلوت میں دعوت بنی ہوئی تھیں۔ خلوت میں چیلنج بن رہی ہو؟ اچھی ادا ہے۔"

وہ ایک ایک قدم چلتی ہوئی صوفے کے پیچھے آ گئی۔ جلال سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کی پشت کی طرف سے جھک کر سرگوشی میں بولی۔ "آپ کو میری بہت سی ادائیں پسند آتی رہیں گی۔"

ایسے وقت دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے قریب ہو گئے تھے۔ ایسی رازدارانہ قربت ملتے ہی وہ نہال ہونے لگا۔ اس کے چہرے کو ایک ہاتھ سے چھو کر بولا۔ "خواب نہ بنو۔ حقیقت کی طرح سامنے آؤ۔ قریب بیٹھ کر باتیں کرو۔"

وہ جھکی ہوئی تھی۔ ایسے وقت اس کا ایک ہاتھ اپنے شانے پر لٹکے ہوئے بیگ میں تھا۔ ہاتھ باہر آیا تو اس میں ریوالور دبا ہوا تھا۔ وہ بہلانے کے انداز میں اپنا دوسرا ہاتھ اس کے چہرے پر پھیر رہی تھی۔ حسن کا ذائقہ منہ کو لگ رہا تھا۔ وہ بے چین ہو رہا تھا۔ سر گھما کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہاری یہ آنکھ مچولی اچھی لگ رہی ہے لیکن کھانا چکھنے کے لئے نہیں... کھانے کے لئے ہوتا ہے۔"

وہ سیدھی کھڑی ہو کر بولی۔ "کھانے کے لئے تو آپ کو یہاں بہت کچھ ملے گا۔"

جلال اکبر مسکرا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت چونک گیا۔ شانے پر ریوالور کی نال چبھ رہی تھی۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر دیکھنا چاہتا تھا۔ خوشبو نے سخت لہجے میں کہا۔ "ڈونٹ موو...... چپ چاپ بیٹھے رہو۔ تمہاری خاموشی زندگی کی ضمانت ہوگی۔"

وہ قیامت خیز حسینہ ان لمحات میں واقعی قیامت بن گئی تھی۔ وہ غصے سے بولا۔ "یہ...... یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

خوشبو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مخصوص انداز میں چٹکی بجائی تو باتھ روم کا دروازہ کھلتا چلا گیا۔ جلال نے ایکدم سے چونک کر اُدھر دیکھا۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے اجنبی نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا ہوا ریوالور تھا یعنی اس بند کمرے میں بڑی خاموشی سے اس کی جان لینے کی بھرپور تیاریاں کی گئی تھیں۔ وہ اس نوجوان کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کون ہو تم......؟"

وہ اسے نشانے پر لے کر کمرے میں آتے ہوئے بولا۔

"تمہاری شامت......"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"ہم چاہتے ہیں، تمہارے مسلح گارڈز یہاں کمرے میں آجائیں اور تم ہمارے ساتھ باہر چلو۔"

جلال اکبر کی سمجھ میں یہی بات آرہی تھی کہ اسے بھاری تاوان حاصل کرنے کے سلسلے میں اغوا کیا جا رہا ہے۔ وہ کبھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ اس کے خلاف انتقامی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ وہ اکرم اور ثریا کو منوں مٹی تلے دبا کر اپنے گھناؤنے جرم پر مٹی ڈال چکا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ظلم کا ایک سرا قانون کے ہاتھوں میں پہنچا ہوا ہے۔

رانا مجید کے بھرپور تعاون نے آخر کار شہروز کو جلال کی شہ رگ تک پہنچا دیا تھا۔ دوست کا قاتل نگاہوں کے سامنے اُس کے نشانے پر تھا۔ سینے میں انتقامی جذبہ لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ جی کر رہا تھا، اسے گولیوں سے بھون ڈالے مگر جوش میں کوئی قدم اٹھا کر وہ دشمن کو موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

جلال نے کہا۔ "میں تمہارا مقصد سمجھ رہا ہوں۔ اپنی ڈیمانڈ بتاؤ۔ میں ابھی انتظام کر دوں گا۔ بس مجھے قیدی نہ بناؤ۔"

شہروز نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ہمیں دولت کی نہیں...... تمہاری ضرورت ہے۔ ہم تمہیں یہاں سے لے جائیں گے۔"

خوشبو نے کہا۔ "میں دروازہ کھول رہی ہوں۔ اپنے دونوں گارڈز کو حکم دو وہ اپنے ہتھیار وہیں باہر پھینک دیں اور خالی ہاتھ اندر چلے آئیں۔"

جلال نے بے بسی سے انہیں دیکھا پھر کہا۔ "جو کہو گے، وہ کروں گا مگر معلوم تو ہو، مجھ سے دشمنی کیا ہے؟"

شہروز نے کہا۔ "تمہیں بعد میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ہم یہاں اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے جو کہا جا رہا ہے، وہ کرو۔"

خوشبو نے آگے بڑھ کر دروازے کو کھول دیا۔ سامنے دو مسلح گارڈز نظر آرہے تھے۔ وہ اپنے آقا کو دیکھ کر چونک گئے۔ ایک نوجوان کا ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا ہوا تھا اور اسے ٹریپ کر کے لانے والی لڑکی کے ہاتھ میں بھی ریوالور دکھائی دے رہا تھا۔

جلال اکبر نے قہراً و جبراً ان سے کہا۔ "اپنے ہتھیار وہیں پھینک دو اور اندر چلے آؤ۔"

دونوں گارڈز اپنے آقا کا حکم سن کر چونک گئے۔ ایک نے کہا۔ "لیکن سر......!"

شہروز نے گرج کر کہا۔ "اگر بحث کرو گے تو تمہارے سر کا سر اڑا دوں گا۔ فوراً ہتھیار پھینکو اور چلے آؤ۔"

دونوں گارڈز نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جلال اکبر نے کہا۔ "دیکھو، کوئی چالاکی نہ دکھانا۔ میری جان بچانا چاہو گے تو جان چلی جائے گی۔ فوراً حکم کی تعمیل کرو۔"

انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے پھر نہ چاہتے ہوئے بھی سر جھکا کر اندر چلے آئے۔ شہروز نے حکم دیا۔ "فوراً باتھ روم کے اندر جاؤ۔"

انہوں نے اپنے آقا کو دیکھا۔ جلال اکبر نے کہا۔ "جو کہا جا رہا ہے، وہ کرو۔"

وہ دونوں باتھ روم کے اندر چلے گئے۔ خوشبو نے آگے بڑھ کر اس دروازے کی چٹخنی باہر سے لگا دی۔ جلال اکبر یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ دشمنوں کے شکنجے میں بری طرح پھنس چکا ہے لیکن ذہن میں یہ سوال کلبلا رہا تھا کہ یہ انجانے دشمن کون ہیں؟ اس سے کیا چاہتے ہیں؟

شہروز اس کے موبائل فون کو اٹھا کر آف کرتے ہوئے بولا۔ "طاقتور شخص کی زندگی میں بھی کمزور لمحات آتے ہیں اور تم دیکھ ہی رہے ہو، کیسے کمزور ہو چکے ہو؟"

وہ الجھ کر بولا۔ "آخر تم ہو کون؟ میرے ایسے کون سے پوشیدہ دشمن ہو جسے میں اب تک پہچان نہیں پا رہا ہوں؟"

"دشمن چہروں سے نہیں انتقامی کارروائیوں سے پہچانے جاتے ہیں اور تم بہت جلد مجھے پہچان جاؤ گے۔"

شہروز نے اپنا ریوالور کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ یہاں رہے گا اور تم اس کے نشانے پر رہو گے۔ یہاں سے باہر گاڑی میں بیٹھنے تک کوئی چالاکی دکھاؤ گے تو جان سے جاؤ گے۔ اردگرد کے لوگوں کو یہی محسوس ہونا چاہئے کہ ہم ایک دوسرے کے دوست یا شناسا ہیں۔"

اس نے پوچھا۔ "تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"بہت کم وقت میں بہت کچھ معلوم کر لینا چاہتے ہو۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ ذرا صبر کرو۔ آگے آگے دیکھتے جاؤ' ہوتا ہے کیا......؟"

وہ سب ہوٹل کی عمارت سے نکل کر ایک گاڑی میں آ گئے۔ شہروز کی ہدایت کے مطابق جلال خاموش تھا۔ اب اس کے دماغ میں یہ بات پک رہی تھی کہ یہ چھوٹے بھائی بلال اکبر کی چال ہے۔ وہ اسے راستے سے ہٹا کر اس کے حصے کی دولت اور جائداد بھی ہڑپ کرنا چاہتا ہے اور ایک ہی چھلانگ میں نیشنل اسمبلی تک کا راستہ بھی ہموار کرنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ وہ پہلے ہی ان انجانے دشمنوں کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ پٹی بندھنے کے بعد راستوں اور علاقوں کی پہچان بھی مٹ گئی۔

☆☆☆

حویلی کے تقریباً سب ہی افراد اس وقت ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ بلال اکبر موبائل فون کان سے لگائے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ کبھی کان سے ہٹا کر اسے دیکھ رہا تھا' کبھی پھر رابطہ کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک صوفے پر اس کی ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسرے صوفے پر جلال اکبر کی بیوی پریشان نظروں سے اپنے دیور کو دیکھ رہی تھی۔ بلال کی بیوی اور بیٹی بھی وہاں موجود تھیں۔ جلال اکبر کا خاص ماتحت رستم سر جھکائے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔

ماں نے بے چین ہو کر کہا۔ "کچھ بتاؤ تو سہی پتر...! رابطہ ہو رہا ہے یا نہیں......؟"

وہ الجھ کر بولا۔ "دوسری طرف فون ہی بند پڑا ہے' رابطہ کیسے ہوگا؟"

جلال کی بیوی نے پریشانی سے کہا۔ "وہ تو اپنا موبائل کبھی آف نہیں کرتے پھر ایسی کیا بات ہوگئی؟ آپ کسی اور سے رابطہ کر کے دیکھیں......"

وہ جلال کے پی اے سے رابطہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔ سر......! میں ابھی آپ سے رابطہ کرنے والا تھا۔ جلال صاحب کا موبائل مسلسل آف مل رہا ہے۔ وہ خیریت سے تو ہیں نا......؟"

"تم ان کے پرسنل اسسٹنٹ ہو' ہم سے زیادہ تمہیں ان کی خبر ہونی چاہئے۔"

"میرا اور ان کا رابطہ زیادہ تر فون پر ہی رہتا ہے۔ صبح سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن......"

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "وہ رات کو عشائیے میں گئے تھے۔ کیا تم ان کے ساتھ نہیں تھے؟"

"میں تو کل دوپہر سے ہوسپٹل میں ہوں۔ میری والدہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اس لئے عشائیے میں چودھری صاحب کے ساتھ نہ جا سکا۔ کیا وہ ابھی تک وہاں سے واپس نہیں آئے......؟"

"پتا نہیں، کہاں رہ گئے ہیں؟ ہم سب ہی پریشان ہیں۔ تم اپنے طور پر معلومات حاصل کرو۔ میں دوسری جگہ رابطہ کرتا ہوں۔"

وہ فون پر دوسرے نمبر پنچ کرنے لگا۔ ایسے ہی وقت ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ جلال اکبر کے وہ دو مسلح گارڈز واپس آ گئے ہیں جنہیں وہ تقریب میں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

بلال نے فوراً ہی انہیں طلب کیا۔ ان کے ذریعے جلال اکبر کی تمام روداد سن کر سب ہی پریشان ہو گئے۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ نہیں ہے۔ کچھ پوشیدہ یا انجانے دشمن ہیں جو اپنے مفاد کے لئے جلال اکبر کو کہیں لے گئے ہیں۔

بلال اکبر فوراً ہی اپنے وسیع ذرائع اور اختیارات استعمال کرنے لگا۔ جلال ایم این اے کی کرسی پر بیٹھنے والا سیاست کا بازیگر کہلاتا تھا۔ ایسے اہم سیاسی لیڈر کا اغوا معمولی بات نہیں تھی۔ پریس اور میڈیا کے ذریعے اس خبر کو جیسے پَر لگ گئے تھے لیکن دوسری طرف شہروز جلال اکبر کے پَر کاٹ رہا تھا۔ وہ اونچی اڑانیں بھرنے والا اپنی پرواز بھولا ہوا تھا۔

اسے ایک ٹارچر سیل میں پہنچایا گیا تھا۔ وہ عادی مجرم نہیں تھا لہٰذا ٹارچر کے ایک جھٹکے میں ہی ظاہری شخصیت کا لبادہ اترنے لگا۔ ثریا اور اکرم کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے بڑے گناہ یاد آ رہے تھے۔ کچھ ایسے سنگین جرائم بھی تھے جن کی پردہ پوشی لازمی تھی۔ وہ کچھ چھپا رہا تھا' کچھ بتا رہا تھا۔ شہروز مووی کیمرے اور کیسٹ ریکارڈر کے ذریعے اس کے اقبالِ جرم کا ایک ایک حرف ریکارڈ کر رہا تھا۔

اس دوران جلال اکبر کو اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ یہ شہروز نامی نوجوان اکرم کا دوست اور کلاس فیلو ہے۔ اُس پر ڈھائے گئے ظلم سے مشتعل ہو کر جلال کے خلاف انتقامی کارروائی کر رہا ہے۔

ڈھول کا پول کسی حد تک کھل رہا تھا۔ اس کی ایسی ایسی کمزوریاں ہاتھ آ رہی تھیں کہ وہ سیاسی رہنما کی حیثیت سے معزز کہلانے والا آئندہ بری طرح بدنام ہونے والا تھا۔ برسوں کی کمائی ہوئی نیک نامی اور عزت ایک نوجوان کے ہاتھوں خاک میں ملنے والی تھی۔

وہ ایک رات اور ایک دن شہروز کا مہمان بنا رہا پھر اسے آزاد کر دیا گیا۔ صیاد نے ایسے پَر نوچے تھے کہ اس کے خلاف فوری طور پر کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی تھی۔

لیکن وہ اقتدار کی کرسی پر حکمرانی کرنے والا کمزور ہونا نہیں جانتا تھا۔ اس کے آدمی کتوں کی طرح شہروز کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ اکرم کے ہاسٹل سے اس کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ جلال اکبر یہ سن کر چونک گیا تھا کہ وہ آئی جی رانا مجید کا ہونے والا داماد ہے۔

اس نے فون کے ذریعے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”میں چودھری جلال اکبر بول رہا ہوں۔ رانا مجید سے بات کرائیں۔“

دوسری طرف سے رانا مجید نے کہا۔ ”جی میں بول رہا ہوں۔ فرمائیں! کیا کام ہے؟“

”کام تو آپ کے ہونے والے داماد نے دکھایا ہے۔“

وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”اسے کہتے ہیں‘ چراغ تلے اندھیرا...... لیکن یہ بات ایسی نہیں ہے کہ آپ کو معلوم نہ ہو۔ اس نے میرے خلاف قدم اٹھا کر اپنی موت کو دعوت دی ہے۔“

”آپ قانون کو ہاتھ میں لینے کی بات کر رہے ہیں۔ کچھ بتائیں تو سہی‘ معاملہ کیا ہے؟“

”شہروز...... یہی نام ہے نا آپ کے داماد کا......؟ اس نے قانون کو ہاتھ میں لیا تھا۔ مجھے ایک رات اور ایک دن تک اپنا قیدی بنا کر رکھا تھا۔ اس وقت آپ اور آپ کا قانون کہاں تھا؟“

رانا مجید نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”اس نے اٹھارہ گھنٹوں تک مجھے حبسِ بے جا میں رکھا ہے۔ میں اس کے خلاف اغوا اور دہشت گردی کا کیس کروں گا۔“

رانا مجید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اب میں صاف طور پر کہہ دوں کہ یہ سب کچھ میری پلاننگ سے ہوا تھا۔ آپ کے خلاف میرے پاس اچھے خاصے ٹھوس ثبوت پہنچ چکے ہیں۔ بہت جلد انہیں عدالت تک پہنچایا جائے گا۔ میرے داماد کو بھول جائیں۔ آپ کے خلاف جو احتساب ہونے والا ہے‘ اُس کی فکر کریں۔“

وہ ایک ذرا پریشان ہوا پھر ڈھٹائی سے بولا۔ ”کیسے ٹھوس ثبوت......؟ کیسا احتساب......؟ آپ کو میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے؟ میں سیاسی طور پر ہی نہیں...... سماجی طور پر بھی اتنا مستحکم ہوں کہ آپ میرے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہیں گے تو آپ کی وردی اتروالی جائے گی۔“

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ”کسی ایک کو تو اترنا ہے۔ میری وردی اترے گی یا آپ کی کھال۔ آپ کے تمام ڈھکے چھپے جرائم کھال سے باہر آنے والے ہیں۔ آپ کی آڈیو ریکارڈنگ اور تحریری اعتراف نامہ ایسا ہے کہ آپ اقبالِ جرم پر مجبور ہو جائیں گے۔“

”میں اور اقبالِ جرم......؟ اُونہہ۔ موت کی دھمکیاں دے کر ایسے جرائم قبول کرائے گئے ہیں جن کا مجھ سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ آپ کے پاس جو ثبوت پہنچے ہیں‘ وہ نمک کا ڈھیر ہیں۔ پانی کی ایک دھار سے سارا نمک بہہ جائے گا۔“

”آپ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ میرے پاس جو کانفیڈنشل فائل تیار ہوئی ہے‘ اُس میں آپ کے علاقے کی اُس لڑکی کا خط بھی موجود ہے جو آپ کے ظلم کا نشانہ بنی تھی اور پھر خودکشی پر مجبور ہو گئی تھی۔“

جلال اکبر ایکدم سے چونک گیا۔ اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”خط......؟ کک...... کون سا خط......؟“

”وہی خط جسے حاصل کرنے کے لئے آپ کا پی اے اکرم کے ہوسٹل تک پہنچا تھا۔ ثریا کے اسکول کی چند کاپیاں اور اس کے ٹیچرز اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ خط ثریا نے ہی لکھا ہے۔ میرے پاس آپ کے خلاف بہت کچھ ہے۔ اور انشاء اللہ...... یہ کانفیڈنشل فائل بہت جلد آپ کا پردہ فاش کر ڈالے گی۔ سی یو سو فار......“

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ جلال اکبر نے گھور کر اپنے فون کو دیکھا پھر اسے سامنے دیوار پر اس زور سے دے مارا کہ اس کا پرزہ پرزہ بکھر گیا۔ وہ ذہنی طور پر الجھ گیا تھا۔ رانا مجید کی ایک ایک بات پتھر کی طرح لگی تھی۔ سوچ کے گھوڑے اپنے بچاؤ کے لئے اِدھر اُدھر...... نہ جانے کدھر کدھر دوڑ رہے تھے۔ رستم ایک طرف کھڑا کسی بھی ہنگامی حکم کا منتظر تھا۔

جلال اکبر تھوڑی دیر تک ٹہلتا رہا پھر ٹیلی فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رستم سے بولا۔ ''یعقوب کو فون ملاؤ...... اسے ابھی اسی وقت یہاں آنے کو کہو......''

وہ فوراً ہی حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ یعقوب اُن خاص اور رازدار ماتحتوں میں سے تھا جو جلال کے اشاروں پر بڑی سے بڑی اور سنگین واردات کرنے میں ایک ذرا دیر نہیں لگاتے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد ہی وہ اس کے سامنے حاضر ہوگیا۔ جلال اکبر اسے تمام صورتحال بتاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے لئے رانا مجید کا پی اے بہت اہم ہے۔ اسے خریدو۔ بڑی سے بڑی رقم کا لالچ دو۔ مجھے کسی بھی طرح وہ خط چاہئے۔''

یعقوب نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں چودھری جی! وہ بکاؤ بندہ نہ بھی ہوا تو میں اس کی کسی کمزوری کو مہرہ بنا کر اس سے اپنا کام نکال لوں گا۔''

وہ کچھ دیر تک اہم معاملات طے کرتے رہے پھر یعقوب وہاں سے رخصت ہوگیا۔ بلال اکبر نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ''وہ آئی جی اپنے داماد کو بھرپور تحفظ دے رہا ہے۔ اسے کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا چکا ہے۔ میرے بندے اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔''

جلال اکبر نے کہا۔ ''فی الحال اس چھوکرے کی اہمیت ثانوی ہوگئی ہے۔ رانا مجید میرے خلاف کانفیڈنشل فائل تیار کررہا ہے۔ اس فائل کو عدالت تک نہیں پہنچنا چاہئے۔''

بلال نے پریشان ہوکر کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا۔ آئی جی اور اس کا داماد اچانک ہی ایسی دشمنی پر کیوں اتر آئے ہیں؟''

جلال نے چور نظروں سے ایک طرف کھڑے ہوئے رستم کو دیکھا۔ بلال اکبر سے ثریا کا معاملہ چھپایا گیا تھا۔ اکرم کے حوالے سے بھی اسے بس اتنا معلوم تھا کہ اس نے جلال اکبر پر حملہ کیا تھا اس لئے اسے قتل کردیا گیا۔ وہ دونوں بھائی اپنے بہت سے اندرونی معاملات ایک دوسرے سے چھپاتے تھے اور جو ظاہر ہوجاتے تھے انہیں دوسروں سے چھپانے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کی ملی بھگت سے ہی اکرم کا کیس دبایا گیا تھا۔

لیکن اب وہ معاملہ آتش فشاں کی طرح پھٹ رہا تھا۔ بلال نہیں جانتا تھا کہ یہ اکرم کے کیس کی ہی ایک کڑی ہے۔ اسی کے حوالے سے جلال اکبر کے خلاف انتقامی کارروائی کی جارہی ہے۔

جلال اکبر نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ''بڑی پرانی کہاوت ہے، گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ آئی جی اور اس کا داماد میری طرف آرہے ہیں جبکہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں، قانون ہمارے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ ہم ہامی بھریں گے تو کھلونا اپنا تماشا دکھائے گا۔''

وہ بولا۔ ''لیکن ابھی آپ نے بتایا ہے، وہ کانفیڈنشل فائل تیار کررہا ہے؟''

''جب بانس ہی نہیں رہے گا تو وہ آئی جی بانسری کیسے بجائے گا؟ میرے بندے اس فائل کو مکھن کے بال کی طرح نکال لائیں گے۔''

''کچھ بھی ہو بھائی جلال! اگر یہ بات پھیل گئی تو سیاسی حلقوں میں بڑی بدنامی ہوگی۔''

''کوشش تو پوری ہے، اس معاملے کو اشتہار بننے اور عدالت تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کردیا جائے۔''

جلال اکبر کی سیاسی ساکھ اور نیک نامی خطرے میں تھی۔ اس کے باوجود اس سیاسی بازی گر کو یقین تھا کہ وہ شرطیہ ہارنے والی بازی بھی جیت لے گا۔

☆☆☆

شہروز روپوش رہنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ رانا مجید اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔ ایسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا چکا تھا جہاں وہ پوری طرح محفوظ تھا۔ صبوحی موجودہ حالات سے بری طرح الجھ گئی تھی۔ صبح شام کی ملاقاتیں جدائی کی صورت اختیار کرگئی تھیں۔ فون پر گفتگو ہوتی رہتی تھی لیکن دل محبوب سے ملنے کے لئے مچلتا رہتا تھا۔ اِدھر یہ بے چین تھی تو اُدھر وہ بے چین تھا۔

شہروز جب سے روپوش ہوا تھا وہ صرف ایک بار رانا مجید کے ساتھ اس سے ملنے آئی تھی۔ باپ کی موجودگی میں ملاقات تشنہ رہ گئی تھی۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ دوبارہ ضد کرنے لگی کہ شہروز سے ملنے کے لئے جانا ہے۔

رانا مجید نے کہا۔ ''موجودہ حالات کو سمجھو.. ہمیں بہت محتاط رہنا ہے۔ وہ دشمن تمہارے ذریعے شہروز تک پہنچ سکتا ہے۔''

وہ الجھ کر بولی۔ ''دن کے اجالے میں نہ سہی، ہم رات کے اندھیرے میں تو اس سے ملنے جاسکتے ہیں؟ پلیز ڈیڈ......! چلیں ناں...... اتنے دنوں بعد کہہ رہی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''میں دفتری معاملات میں بری طرح الجھا ہوا ہوں۔ فی الحال نہیں جاسکوں گا۔''

باپ کی بات سن کر اس کا منہ لٹک گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ''اپنے ماتحت سے کہہ دوں گا۔ وہ اپنی نگرانی میں تمہیں وہاں لے جائے گا۔''

وہ مارے خوشی کے لہرا گئی تھی، مگر باپ کے سامنے کھل کر خوشی کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ''ایک یا ڈیڑھ ماہ بعد پیپرز ہونے والے ہیں۔ میں نوٹس لے جاؤں گی۔ وہ وہیں تیاری کرتا رہے گا۔''

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ ایک سپاہی کے ساتھ شہروز کے پاس پہنچ گئی۔ وہ ماتحت اسے کمرے میں پہنچا کر پہریداری کے لئے باہر چلا گیا۔ اس کی موجودگی میں رسمی طور پر ایک دوسرے کا حال پوچھا گیا پھر تنہائی ملتے ہی حالات بدل گئے، ماحول بدل گیا۔ وصال کا موسم آیا تو آب و ہوا بدل گئی۔ پیار کا موسم ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہوا کے رخ کا پتا ہی نہیں چلتا۔

محبوب کی قربت نصیب ہو رہی تھی۔ پاس آ کر دور جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ محتاط نظروں سے دروازے کو دیکھتے ہوئے اس سے الگ ہو کر بولی۔ ''وہ کسی بھی کام سے اندر آ سکتا ہے۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''فون پر باتیں ہوتی رہتی ہیں مگر ایسی ملاقات کے لئے دل مچلتا رہتا ہے۔''

وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''منع کیا تھا' ثریا اور اکرم کے معاملے میں ہاتھ نہ ڈالو مگر کسی نے میری نہیں سنی۔ اب دیکھو! کیسے چوروں کی طرح تمہیں چھپ کر رہنا پڑ رہا ہے؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''ہمیں بہت بڑی کامیابی مل رہی ہے۔ یہ عارضی پریشانی ہے۔ جلد ہی ختم ہو جائے گی۔''

وہ منہ بنا کر بولی۔ ''یہ کامیابی فی الحال ادھوری ہے۔ پتا نہیں وہ کب گرفت میں آئے گا اور کب تم یہاں سے نکلو گے؟''

''کچھ زیادہ ہی برہم دکھائی دے رہی ہو؟''

''کیا برہم نہیں ہونا چاہئے؟ لگتا ہے' کسی قیدی سے ملنے آئی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد وہ باہر پہرا دینے والا آواز لگائے گا۔ بی بی! ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔''

وہ اس کی بات سن کر ہنسنے لگا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''ہنسو مت...... یہاں کسی مجرم کی طرح چھپے بیٹھے ہو۔ میں تو بالکل تنہا ہو کر رہ گئی ہوں۔ ڈیڑھ ماہ بعد پیپر ہیں۔ تمہیں ان کی بھی تیاری کرنی ہے۔''

ایسے ہی وقت شہروز کے فون کا بزر بولنے لگا۔ وہ اس کی اسکرین پر نمبر پڑھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ڈیڈ کال کر رہے ہیں۔''

پھر وہ اسے آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''السلام علیکم انکل......!''

دوسری طرف سے رانا مجید نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے! تمہیں ابھی یہ پناہ گاہ چھوڑنی ہو گی۔ میرا ایک ماتحت تمہارے پاس پہنچ رہا ہے۔ اس کی رہنمائی میں دوسری جگہ منتقل ہونے کی تیاری کرو۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیوں انکل......! کوئی پرابلم ہو گئی ہے؟''

''ہوئی تو نہیں ہے۔ شاید ہونے والی ہے۔ میں حفظِ ماتقدم کے طور پر تمہیں شفٹ کر رہا ہوں۔''

صبوحی غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ فون پر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ آپ کا ماتحت آئے گا تو میں اس کے ساتھ دوسری جگہ چلا جاؤں گا۔ بائی دا وے...... جلال کے خلاف کارروائی شروع ہونے میں مزید کتنے دن لگیں گے؟''

''وہ سیاسی مگر مچھ ہے۔ قابو کرنے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔ میں نے فائل تیار کر لی ہے۔ افسرانِ بالا سے میٹنگ بھی ہو رہی ہیں۔''

صبوحی تذبذب میں تھی۔ پوری صورتحال جاننا چاہتی تھی۔ بے چینی سے شہروز کا منہ تک رہی تھی۔ پھر اس سے فون جھپٹ کر اپنے کان سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''ہیلو ڈیڈ......! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا مسئلہ ہے؟ شہروز کو دوسری جگہ کہاں بھیجا جا رہا ہے؟''

وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ''نہیں میری جان! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں تو بس اس کی بھرپور حفاظت کے لئے......''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''پلیز ڈیڈ! میں آئی جی کی بیٹی ہوں۔ ایسے معاملات کی سنگینی کو بخوبی سمجھتی ہوں۔ آپ دونوں نے جلال اکبر سے مخالفت مول لے کر بہت برا کیا ہے۔''

''ظالم کا سر کچلنے کے لئے خطرات مول لینے پڑتے ہیں۔ خود کو آئی جی کی بیٹی کہہ رہی ہو پھر حوصلہ کیوں ہار رہی ہو؟''

''بات حوصلے کی نہیں ہے ڈیڈ......!''

وہ بولا۔ ''تم گھر آ جاؤ۔ شہروز کو ابھی دوسری جگہ جانا ہے۔''

''یہ دوسری جگہ کہاں ہے؟''

"یہ باتیں گھر آ کر بھی ہو سکتی ہیں۔ فون شہروز کو دو۔"

اس نے بے دلی سے فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ تھوڑی دیر تک ان کے درمیان معاملات طے ہوتے رہے پھر رابطہ ختم ہو گیا۔

رانا مجید کو کامیابی کی بھرپور امید تھی۔ وہ اپنے ہونے والے داماد کے تعاون سے جلال کے خلاف ایسے ہتھیار جمع کر چکا تھا کہ وہ اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔

جلال اکبر اپنے اقبالِ جرم کو جھٹلا سکتا تھا۔ شہروز کے خلاف یہ بیان دے سکتا تھا کہ اس نے تشدد کے ذریعے جبراً اس سے یہ جرائم قبول کرائے ہیں۔ لیکن ثریا کا خط اس کے لئے پھانسی کا پھندا بن سکتا تھا۔

☆☆☆

انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ازل سے تدبیریں کرتا آیا ہے۔ نئے نئے راستے تلاش کرتا آیا ہے۔ رانا مجید کا پی اے اپنی ضرورتوں سے مجبور تھا۔ کمی بندھی تنخواہ میں لگا بندھا گزارہ ہوتا تھا۔ جلال اکبر کی بھرپور آفر جیسے سسکتی ہوئی زندگی کو آکسیجن ماسک پہنا رہی تھی۔ ایک معمولی سے خط کے بدلے نعمتِ غیر مترقبہ ہاتھ آ رہی تھی۔

یعقوب نے اسے ایسے سہانے خواب دکھائے کہ وہ ضمیر کو سُلا کر اپنے بخت جگانے پر آمادہ ہو گیا۔ دو روز بعد ہی یعقوب اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر جلال اکبر کے سامنے حاضر ہو گیا۔ وہ ثریا کے خط کو ہاتھ میں لے کر بولا۔

"افسوس......! اب رانا مجید کی ساری تدبیریں الٹی ہو جائیں گی۔"

پھر وہ فاتحانہ انداز میں مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ "ہم چودھری ہیں، کبھی زیر ہونا نہیں جانتے۔ اپنی حاکمیت سے اور حکمتِ عملی سے ہمیشہ زبر ہی رہتے ہیں۔"

ایک طرف کھڑے ہوئے رستم نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "بے شک۔ اب ہو گا دشمن کا منہ کالا......"

جلال اکبر نے وہ خط حاصل کر کے اپنے خلاف شروع ہونے والے مقدمے کو کمزور بنا ڈالا تھا۔ اس سے پہلے کہ رانا مجید اپنی کارروائی شروع کرتا، جلال اکبر نے اس کے خلاف یہ بیان شائع کروایا کہ آئی جی کے داماد شہروز نے اسے اغوا کر کے بری طرح ٹارچر کیا ہے۔ جبراً وہ جرائم قبول کرائے ہیں جن کا اس کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور شہروز نے ایسی مجرمانہ حرکت اپنے سسر رانا مجید کے بھرپور تعاون سے کی ہے۔ وہ قانون کے لبادے میں چھپا ہوا ایک دہشت گرد ہے۔

رانا مجید اس کا بیان پڑھ کر چونک گیا تھا۔ حیران تھا کہ وہ چوہا بن جانے والا شیر پھر سے طاقتور کیسے ہو گیا؟ فی الوقت وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کا ماتحت درپردہ اس کی جڑیں کاٹ چکا ہے۔

جلال اکبر نے اسے فون پر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اور سنائیں آئی جی صاحب......! ہواؤں کا رخ بدل گیا ہے۔ اب تو آپ کے دل و دماغ پر ہماری چودھراہٹ کی دھاک بیٹھ گئی ہو گی؟"

"مجھے آپ سے ایسی نادانی کی امید نہیں تھی۔ میں ایک ثبوت پیش کروں گا تو آپ کے تمام بیانات کی تردید ہو جائے گی۔"

وہ ہنس کر بولا۔ "جس طرح دیو کی جان طوطے میں ہوتی ہے۔ اسی طرح آپ کی کانفیڈنشل فائل کی جان اُس لڑکی کا وہ خط تھا۔"

رانا مجید نے چونک کر پوچھا۔ "تھا کا کیا مطلب......؟"

"پھر تو آپ مجھ سے بڑے بیوقوف نکلے یعنی آپ کو اپنے موجودہ حالات کا علم نہیں ہے؟"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم شکار کھیلنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، شکار ہونے کے لئے نہیں......آپ اپنی کانفیڈنشل فائل چیک کریں۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ رانا مجید نے سوچتی ہوئی نظروں سے ریسیور کو دیکھا پھر اپنے پی اے کو ایک چابی دیتے ہوئے کہا کہ کانفیڈنشل فائل فوراً پیش کرے۔ پی اے وہ چابی اٹھا کر سامنے والی الماری کے پاس گیا پھر وہاں سے وہ فائل نکال کر اس کے سامنے لے آیا۔

رانا مجید نے اسے کھول کر دیکھا تو پتا چلا جلال اکبر کے خلاف وہ ٹھوس ثبوت ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گیا ہے۔ ساری محنت پر پانی پھر گیا ہے۔ اس نے گھور کر اپنے پی اے کو دیکھا پھر اس فائل کو اس کے سامنے پھینکتے ہوئے پوچھا۔ "ثریا کا وہ خط کہاں ہے؟"

وہ پریشانی ظاہر کرتے ہوئے فائل پر جھک کر اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولا۔ "سر......! وہ خط اسی فائل میں رکھا ہوا تھا۔"

"رکھا ہوا تھا تو پھر وہ کہاں گیا؟ کیا اسے پَر لگ گئے یا لگا دیے گئے؟"

وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ "سر! میں آپ کے سامنے فائل لے جاتا ہوں اور لاتا ہوں۔ پھر لے جا کر لاک کر دیتا ہوں۔ چابی آپ کے پاس رہتی ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں

سر......!"

"جلال اکبر نے جو تحریری بیان دیا ہے اور اقبالی جرم کیا ہے' وہ تمام کاغذات یہاں موجود ہیں۔ صرف اس خط کو چرایا گیا ہے۔ کسی دن ان کاغذات کو بھی چرالیا جائے گا۔ آج سے یہ فائل میرے گھر میں رہے گا۔ میں تمہاری کوتاہی کے باعث تمہیں سسپنڈ کرتا ہوں۔"

"سر......! میرا قصور کیا ہے۔ چابی تو آپ کے پاس رہتی ہے۔"

"میں جرائم کی دنیا کا انسپکٹر جنرل آف پولس ہوں۔ اتنا تو سمجھتا ہوں کہ ڈپلیکیٹ چابیاں بنوائی جاسکتی ہیں۔ تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم نے یہ حرکت نہیں کی ہے۔ ناؤ گٹ لاسٹ......"

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ یہ خبر شہروز نے سنی تو پریشان ہوکر فون پر رانا مجید سے بولا۔ "یہ سب کیسے ہوگیا انکل......؟ وہ خط اس کیس میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کے دفتر سے کیسے غائب ہوگیا؟"

"مجھے یقین کی حد تک شبہ ہے کہ میرا پی اے جلال اکبر کے ہاتھوں بک گیا ہے۔ میں نے اسے سسپنڈ کردیا ہے۔"

"مگر اس سے کیا ہوگا انکل......؟ وہ دشمن تو ریت کی طرح ہماری مٹھی سے نکل گیا ہے۔"

"ریت مٹھی سے نکل کر بھی کچھ ہاتھ میں رہ جاتی ہے اور میں اس دشمن کو پوری طرح نکلنے نہیں دوں گا۔"

"انکل! اب پتا چل رہا ہے کہ وہ کس قدر شاطر ہے؟ بہت پہنچا ہوا ہے۔ جو آپ کی کانفیڈنشل فائل تک پہنچ گیا، وہ اور نہ جانے کہاں کہاں تک پہنچتا ہوگا؟"

"یہ تو ماننا ہی ہوگا کہ وہ بہت پہنچا ہوا ہے۔"

"اس کا اعتراف نامہ ہمارے کام آئے گا۔"

"نہیں بیٹے! فی الوقت اس اعتراف نامے کی کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔"

"مائی گاڈ! یعنی معاملہ بالکل ہی ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے؟"

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ میں آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ جب تک عدالتی کارروائی نتیجے پر نہ پہنچے، تم روپوش ہی رہو۔"

بازی پلٹ گئی تھی۔ دشمن زبر ہوگیا تھا۔ رانا مجید کا نام قانون کے وفاداروں کی اس لسٹ میں آتا تھا جنہوں نے اپنی ذہانت سے بڑے بڑے مجرموں اور دہشت گردوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچایا تھا۔ سب ہی اس کی [illegible] سخت گیر طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اعلیٰ افسران اس کی حمایت میں بول رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جلال اکبر نے پوری طرح اس کی کمر نہیں توڑی ہے۔ وہ یہ مقدمہ جیت لینے کی بھرپور کوشش کرے گا۔

جلال اکبر کو ادھوری فتح نصیب ہوئی تھی۔ ابھی شہروز سے انتقام لینے کی آگ دل میں سلگ رہی تھی۔ ان معاملات کے دوران وہ ذہنی طور پر تھک گیا تھا۔ عیاشی اور تفریح کی عادت اسے ڈیرے پر لے آئی تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ اپنے خاص وفاداروں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ جام پر جام چل رہے تھے۔ رستم بھی وہاں موجود تھا۔ چودھری نے نشے میں جھومتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "اوئے رستم......! ادھر آ......"

وہ فوراً ہی ہاتھ جوڑ کر اس کے قریب چلا آیا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولا۔ "یہاں بیٹھ......!"

وہ انکار کرتے ہوئے بولا۔ "نا چودھری جی! نا...... میں کمی کمین ہوں۔ میری جگہ آپ کے قدموں میں ہے۔"

وہ اس کے قدموں میں بیٹھنا چاہتا تھا۔ جلال نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تو میرا سب سے رازدار اور وفادار بندہ ہے۔ تیرے سینے میں ایسے راز دفن ہیں جنہیں یہاں بیٹھے ہوئے تجھے نہیں جانتے اگر تو کمتر ہوتا تو میں تجھے اپنے قریب بیٹھنے کو نہ کہتا۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ تو ٹھیک ہے۔ پر......"

ایک حواری نے کہا۔ "جب چودھری جی کہہ رہے ہیں تو سوال جواب نہ کر۔ چپ چاپ بیٹھ جا......"

وہ ہچکچاتا ہوا جلال اکبر سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ دوستانہ انداز میں ایک ہاتھ اس کے شانے پر مارتے ہوئے بولا۔ "سنا ہے تیری بیٹی کی شادی نہیں ہورہی ہے؟ کیا رشتہ کہیں سے نہیں آرہا ہے۔"

"رشتے کی تو بات نہ پوچھیں، بہت آتے ہیں۔"

"ضرور آتے ہوں گے۔ تیری بیٹی ہمارے علاقے کی سب سے خوبصورت اور چنگی کڑی ہے پھر دیر کس بات کی ہے؟"

"پتا نہیں اس کے دل میں کیا ہے؟ جو بھی رشتہ آتا ہے، انکار کردیتی ہے۔"

وہ نشے میں دُھت ہورہا تھا۔ ایک ہاتھ لہرا کر بولا۔ "پھر تو سمجھ لے کسی مرد کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ کوئی خوش

نصیب اس کی جوانی لوٹ رہا ہوگا۔"

وہ دوسرے حواریوں کے سامنے جھینپ گیا۔ ٹپٹا کر بولا۔ "ایسی بات نہ کریں سرکار۔! رُستم کے گھر میں ڈاکا ڈالنے والا ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔"

وہ سمجھانے کے انداز میں بولا "دیکھ میری بات غور سے سن......! زیادہ انتظار کرنے سے میٹھا پھل سڑ جاتا ہے۔ گل جاتا ہے۔ کھانا چاہئے آدمیوں کو مگر اسے کیڑے کھانے لگتے ہیں۔ کیوں اس کی جوانی کو زنگ لگا رہا ہے؟ اسے میری جھولی میں ڈال دے۔"

رستم ایکدم سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ بے یقینی سے جلال اکبر کو دیکھنے لگا پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ مم... میری بیٹی آپ کی دلہن بنے گی۔ اس کے تو نصیب جاگ جائیں گے سرکار......!"

جلال اکبر نے ذرا اِدھر اُدھر ہلتے ہوئے نشیلی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا بکواس کررہا ہے؟ اپنی اوقات کو بھول کر چودھریوں سے رشتے داری کے خواب دیکھ رہا ہے؟"

وہ ایکدم سے بوکھلا کر بولا۔ "نہ سرکار! میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ ابھی آپ نے خود ہی ایسی بات کہی ہے۔ بے شک یہاں کسی بھی بندے سے پوچھ لیں۔"

جلال اکبر دائیں بائیں اپنے حواریوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔ تم لوگ بتاؤ۔ میں نے شادی کی کوئی بات کی ہے؟"

وہ سب ہی انکار میں سر ہلانے لگے۔ رستم نے پریشان ہو کر سب کو دیکھا پھر پوچھا۔ "تو پھر آپ نے کہا کیا تھا......؟"

وہ بولا۔ "میں نے کہا تھا' جھولی میں ڈال دے۔ رات کو آئے گی' صبح چلی جائے گی۔"

وہ لرز کر رہ گیا۔ فوراً ہی اس کے قدموں میں گرتے ہوئے بولا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چودھری جی! میں آپ کا نمک خوار ہوں' وفادار ہوں۔ میری بیٹی کے لئے ایسی بات نہ کریں۔"

وہ اسے دور ہٹاتے ہوئے بولا۔ "تو میرے لئے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو یہاں لا چکا ہے۔ آج اپنی بیٹی کی باری آئی ہے تو رحم کی بھیک کیوں مانگ رہا ہے؟ میں اس بچی پر کوئی ظلم نہیں کروں گا۔ اسے پھول کی طرح کبھی کبھی گلدان میں سجا لیا کروں گا۔"

وہ غصے اور صدمے سے کانپ رہا تھا۔ غصہ دکھا نہیں سکتا تھا اس لئے روتے ہوئے بولا۔ "میں باپ ہوں سرکار! آپ کے اس حکم کی تعمیل نہیں کر سکوں گا۔ مجھے مرنے کو کہیں، ابھی اپنی جان دے دوں گا۔"

جلال دوسرے حواریوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ باپ ہو کر اپنی بیٹی کو خود یہاں لائے گا تو اس کی غیرت اسے گالیاں دے گی۔ میں اپنے وفادار کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

رستم نے سر اٹھا کر پرامید نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ "یہ دوسروں کی بیٹیوں کو لاتا رہا ہے۔ اس کی بیٹی کو تم لوگ لے آؤ۔ جاؤ......"

رستم تڑپ کر اس کے قدموں سے لپٹتے ہوئے بولا۔ "مجھ پر رحم کریں۔ سرکار......! آپ کو میری وفاداریوں کا واسطہ...... یہ ظلم نہ کریں۔ مجھ پر رحم کریں۔"

کسی کو بھی بے دریغ قتل کر دینے والا وہ پہاڑ جیسا رستم اپنے آقا کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے علاقے سے لے کر اسمبلی تک مطلق العنان بادشاہ تھا۔ اس کو اور اس کے پورے خاندان کو کچل کر رکھ دیتا۔ اس کے رونے اور گڑگڑانے سے حاکم کا حکم ٹلنے والا نہیں تھا۔ وہ مکافاتِ عمل کے ایسے چکر میں آیا تھا کہ وہاں سے اُٹھ کر جاتے جاتے چکرا کر فرش پر گر پڑا۔

اُدھر جلال اکبر زیادہ پی لینے کے باعث بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک گیا۔ حواری سمجھ گئے کہ اب وہ دوسری صبح تک مدہوشی کی نیند سوتا رہے گا۔ رُستم کی بیٹی کو اُٹھانے کا معاملہ کسی دوسری رات کے لئے ٹل گیا تھا۔

☆☆☆

شہروز کو یقین تھا کہ آئی جی جیسے اعلیٰ افسر کے تعاون سے وہ جلال اکبر کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکے گا لیکن اس خط کی گمشدگی نے یقین کو مایوسی میں بدل دیا تھا۔

رانا مجید نے اتنے بڑے اور بنیادی ثبوت کے گم ہو جانے کے باوجود بڑے مستحکم لہجے میں کہا تھا کہ جلال اکبر سے نمٹ لیا جائے گا۔ وہ واقعی ایسا ضدی افسر تھا کہ کسی مجرم کی گردن دبوچنے کے بعد اسے قانون کے قدموں میں لاکر ضرور گراتا تھا۔

شہروز کو یقین تو نہیں تھا لیکن اپنے ہونے والے سسر سے ایک موہوم سی اُمید ضرور تھی کہ وہ کوئی قانونی ہتھکنڈہ آزمائے گا۔ وہ اسی اُمید پر روپوش رہ کر اپنی صبوحی سے دور تنہا رہ کر زندگی کے خوبصورت لمحات ضائع کر رہا تھا۔

دوسری طرف جلال اکبر کے سینے میں انتقام کا لاوا پک

رہا تھا۔ کسی نے آج تک اسے چھونے کی بھی ہمت نہیں کی تھی لیکن شہروز کی قید میں وہ مسلسل اٹھارہ گھنٹوں تک اس کے لاتیں جوتے کھاتا رہا تھا۔ ایسی بدترین ذلت کے احساسات اس کے غیظ و غضب کو بھڑکا رہے تھے۔ کئی حواری اسے تلاش کرنے کے سلسلے میں مسلسل ناکام ہو رہے تھے۔

جلال اکبر نے جھنجلا کر رانا مجید سے فون پر رابطہ کیا پھر کہا۔ "آپ اپنے داماد کو کب تک چھپا کر رکھیں گے؟ جب مقدمہ شروع ہوگا تو آپ اسے عدالت میں پیش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

رانا مجید نے کہا۔ "آپ کے بیان کے مطابق شہروز نے آپ کو اغوا کیا اور جبراً اعتراف نامہ لکھوایا۔ شہروز پر یہ مقدمہ ذرا بعد میں چلے گا۔ اس سے پہلے ثریا کی عزت سے کھیلنے اور اکرم کو قتل کرنے کا مقدمہ شروع ہوگا اور اسے لکھ لیں کہ عدالت میں پیشی کے پہلے ہی دن آپ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "تعجب ہے۔ جن پَروں سے پرواز کر رہے تھے، میں نے وہ پَر کاٹ ڈالے ہیں پھر بھی یہ گمان ہے کہ مجھے گرفت میں لے سکیں گے؟"

"میری کانفیڈنشل فائل سے ایک خط اڑا کر ہواؤں میں اڑ رہے ہیں جناب......! یہ بھول گئے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ اور بھی ہے......ایک ثبوت اور بھی ہے۔ ایسا ٹھوس ثبوت کہ عدالت میں پیش ہوتے ہی چودھری صاحب کے پیروں تلے سے زمین نکل جائے گی۔"

اس نے پریشان ہو کر اپنے فون کو یوں دیکھا جیسے آئی جی کا منہ دیکھ رہا ہو۔ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ اس کے خلاف کون سا طلسمی چراغ مدعی کے ہاتھ آ گیا ہے؟ پھر اس نے ناگواری سے کہا۔ "کیا ہوا میں تیر چلا رہے ہو؟ ایسے تیر مجھ تک کبھی نہیں پہنچیں گے۔"

"چلیں۔ آپ خوش فہمی میں مبتلا رہیں۔ مقدمہ شروع ہونے دیں۔ پھر آپ تیل بھی دیکھیں گے اور تیل کی دھار بھی......"

دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ جلال اکبر فون ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا۔ رانا مجید کا پُر اعتماد لہجہ اور اس کی ٹھوس آواز سمجھا رہی تھی کہ وہ ثریا اور اکرم کے سلسلے میں کوئی دور کی کوڑی لا رہا ہے۔

وہ فون بند کر کے اٹھ گیا۔ اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ ثریا اور اکرم کے معاملے میں مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا پھر ایکدم سے چونک گیا۔ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ جو خط چرایا گیا تھا، اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

پھر تیزی سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا۔ الماری کے پٹ کو ایک جھٹکے سے کھول کر اس کی ایک دراز کو کھولا۔ وہاں ثریا کا وہ خط رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر پھر کھول کر اس تحریر کو بڑے غور سے تکنے لگا۔

اس کا دماغ چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا۔ "کیا یہ ثریا کی ہی تحریر ہے؟ کیا اس نے یہ خط اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے؟"

جواب یہ سمجھ میں آیا کہ اگر یہ خط عدالت میں پیش کیا جاتا تو اس کے اسکول کی لکھی ہوئی کاپیوں سے خط کی تحریر کا موازنہ کیا جاتا۔ ٹیچرز وغیرہ سے بھی گواہی لی جاتی۔ تب ہی تصدیق ہوتی کہ وہ ثریا کی اپنی تحریر ہے۔

جلال اکبر نے پریشان ہو کر سوچا۔ "لیکن میں کیسے موازنہ کروں؟ کیسے تصدیق ہوگی کہ یہ اصلی خط ہے؟"

ظاہر ہے، تصدیق کرنے کے لئے اسے بھی یہی کرنا تھا۔ طلبا و طالبات کے امتحانات کی کاپیاں اسکول میں محفوظ رہتی ہیں۔ وہاں ثریا کی کاپیوں سے اس خط کی تحریر کو پرکھا جا سکتا تھا اور وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ ٹیچرز وغیرہ تصدیق کرنے کے لئے اس خط کو پڑھتے پھر یہ بھید کھل جاتا کہ وہ براہِ راست یا بالواسطہ ثریا کی عزت سے کھیلنے والا قاتل ہے۔

وہ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے پھر اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے؟ کس طرح معلوم کرے کہ اس کے ہاتھوں میں ثریا کا ہی لکھا ہوا خط ہے؟

ایسی پریشانی کے عالم میں اچانک ہی مشکل آسان ہوگئی۔ ایک ملازم نے آ کر کہا۔ "ماسٹر امام دین ملنے آیا ہے۔"

وہ غصے سے ملازم کو جھڑکنا چاہتا تھا پھر ایکدم سے عقل آ گئی کہ ماسٹر امام دین ثریا کا باپ بھی ہے اور اس کا ماسٹر بھی.....اس سے زیادہ وہ تحریر کو اور کون سمجھ سکے گا؟

اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اتنی سی بات پہلے میری عقل میں کیوں نہیں آئی......؟"

اس نے ملازم سے کہا۔ "ماسٹر کو بٹھاؤ۔ ہم آتے ہیں۔"

ملازم چلا گیا۔ اس نے خط کو پڑھا پھر اسے اس طرح تہہ کیا کہ صرف چند سطریں نظر آنے لگیں۔ باقی تحریر چھپ گئی۔ ان چند سطروں سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اس نے ثریا پر کوئی ظلم کیا ہے۔

وہ وہاں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ ماسٹر امام

دین فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ فوراً ہی سلام کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جلال اکبر نے کہا۔ ''ہمیں کہیں سے ایک خط ملا ہے۔ یوں لگتا ہے، اسے تمہاری بیٹی نے لکھا ہے۔ تم نے تو بچپن سے اسے لکھتے پڑھتے دیکھا ہے۔ کیا اس کی تحریر پہچان سکتے ہو؟''

ماسٹر امام دین کے دل سے ایک آہ نکلی۔ ''آہ میری بچی......! پتا نہیں کیوں باپ سے روٹھ کر موت کو گلے لگا لیا؟ میں اس کی لکھاوٹ کے ایک ایک حرف کو پہچانتا ہوں۔''

جلال اکبر نے دونوں ہاتھوں سے اس تہہ کئے ہوئے خط کو پکڑ رکھا تھا تاکہ وہ چند سطروں سے آگے نہ کھلے۔ اس نے کہا۔ ''یہاں آؤ اور اسے پڑھو۔''

وہ عینک لگاتا ہوا اس کے قریب آیا پھر اس تحریر کو غور سے پڑھنے لگا۔ بڑی توجہ سے ایک ایک لفظ کو تکنے لگا پھر انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں سرکار......! یہ میری ثریا کی لکھاوٹ نہیں ہے۔''

جلال اکبر کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا پھر بھی اسے یقین نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔ ''ماسٹر! تیری عینک تو ٹھیک ہے؟ برسوں سے یہی ایک عینک ناک پر اٹکائے پھرتا ہے۔ اسے بدلتا کیوں نہیں؟''

وہ تحریر کو اس کے اور آگے لے جاتے ہوئے بولا۔ ''اسے اچھی طرح دیکھ۔ اچھی طرح دھیان سے پڑھ...... اسے تیری بیٹی نے لکھا تھا۔''

وہ عینک کو قمیص کے دامن سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''عینک تو ٹھیک ہے مالک! آپ کا حکم ہے تو میں اسے پھر سے پڑھتا ہوں۔''

وہ دوبارہ اس تحریر کو غور سے دیکھنے اور پڑھنے لگا۔ ایک بار نظریں اُٹھا کر دیکھا تو چودھری اسے گھور رہا تھا۔ وہ پھر اس تحریر کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔ آخر سہم کر ذرا پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''میں دس بار دیکھوں گا تب بھی اس لکھاوٹ میں میری بیٹی دکھائی نہیں دے گی۔ اسے کسی اور نے لکھا ہے۔''

جلال اکبر کو یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ دھوکا کھا رہا ہے۔ اصل کی خوش فہمی میں نقل سے بہل رہا ہے۔ فون پر رانا مجید نے کہا تھا۔ ''چلیں۔ آپ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ مقدمہ شروع ہونے دیں پھر آپ تیل بھی دیکھیں گے اور تیل کی دھار بھی......''

اب اس بات کا اصل مفہوم سمجھ میں آ رہا تھا۔ رانا مجید اپنے پی اے کے ذریعے ایک جعلی خط اس کے ہاتھوں میں پہنچا کر اسے بیوقوف بنا رہا تھا۔ اس نے جھنجلا کر خط کو مٹھی میں یوں بھینچ لیا جیسے اس آئی بی اف پولس کی گردن دبوچ رہا ہو۔

ماسٹر امام دین نے کہا۔ ''مالک! آپ سخی داتا ہیں۔ آپ نے کہا تھا، آج آ کر پچاس روپے لے جاؤں۔ بیٹی کے لئے......''

وہ غصے سے گرج کر بولا۔ ''چل بھاگ یہاں سے۔ ورنہ جوتوں سے منہ لال کر دوں گا۔''

وہ سہم کر، سر جھکا کر اُلٹے قدموں چلتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس نے اپنے خاص ماتحت یعقوب کو بلا کر خوب گالیاں دیں پھر اس خط کو اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔ ''تم نے تو رانا مجید کے پی اے کو خرید لیا تھا۔ یہ دیکھو اس نے جعلی خط تھما کر ہمیں بیوقوف بنایا ہے۔ جاؤ اس کم ذات کو پکڑ کر ہمارے شکاری کتوں کے آگے ڈال دو۔ رانا مجید پہلے سے ہوشیار تھا۔ وہ اصل خط ہمارے ہاتھ لگنے نہیں دے گا۔''

وہ ماتحت اس پی اے کی موت بننے چلا گیا اور وہ جیتی ہوئی بازی ہارنے والا غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اِدھر سے اُدھر یوں تیزی سے ٹہلنے لگا جیسے رانا مجید سے پیچھا چھڑا کر بھاگتا جا رہا ہو۔

ایسے وقت بلال اکبر وہاں آیا۔ اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ بھائی کسی مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

وہ ثریا کے معاملے کو اب تک بھائی سے چھپاتا آ رہا تھا۔ اس نے دھتکارنے کے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''خیریت ہے۔ تم جاؤ۔ اپنے کام سے کام رکھو۔''

وہ بھائی کو ایک ذرا نفرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اکرم کے معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا ہوں۔''

جلال نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ نے اپنے ہی علاقے کی لڑکی کو ظلم کا نشانہ بنایا۔ اسے خودکشی پر مجبور کر دیا پھر اس نوجوان کی بھی جان لے لی۔ یہ آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟''

وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ ''تم اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو؟''

''کیونکہ آپ کے ایسے کارناموں سے ہماری ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''ابھی تو نہیں پہنچ رہا ہے لیکن تم گڑے مُردے اکھاڑو گے تو ضرور پہنچے گا جو بات دب گئی ہے، اس پر بحث کیوں کر رہے ہو؟''

''کیونکہ آپ ابھی تک اسی معاملے میں اٹکے ہوئے

ہیں۔ ساری مصروفیات کو بھول کر ابا جی کے داماد کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔"

وہ بھڑک کر بولا۔ "کیا میں اسے بھول جاؤں جس نے مجھ پر...... چودھری جلال اکبر پر ہاتھ اٹھایا ہے؟ اٹھارہ گھنٹوں تک تشدد کا نشانہ بنایا ہے؟ ہمارے باپ دادا، پردادا کے زمانے سے کسی نے کبھی چودھریوں سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی جرات نہیں کی۔ جب مجھے وہ وقت یاد آتا ہے تو خون کھولنے لگتا ہے۔"

وہ سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "چوہا مارنے کے لئے شیر مارنے کا سامان کرنا سراسر بے وقوفی ہے۔ آپ کا غصہ درست ہے لیکن جوش میں آکر ہوش نہیں کھونا چاہئے۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "اچھا تو جو کچھ میں کر رہا ہوں، وہ بے وقوفی ہے؟ جاؤ یہاں سے...... مجھے تمہارا لیکچر نہیں سننا ہے۔ میں اپنے معاملات سے نمٹنا جانتا ہوں۔ وہ لڑکا میرے لئے چیلنج بن گیا ہے۔ اسے جہنم رسید کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

بلال نے کہا۔ "ابا جی کا قاتل بھی ہمارے لئے چیلنج بنا ہوا ہے۔ آپ اتنے اہم معاملے کو اہمیت کیوں نہیں دے رہے ہیں؟"

وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا، ایسے ہی وقت ایک ملازم نے آکر جلال اکبر سے کہا۔ "چودھری جی! رستم کی گھر والی آئی ہے۔ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے، رستم کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ اسپتال میں ہے۔"

جلال اکبر کے ظالمانہ حکم نے رستم کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ بیٹی پر ابھی آنچ نہیں آئی تھی لیکن کسی وقت بھی اس کی عزت کی دھجیاں اڑائی جا سکتی تھیں اور وہ اس علاقے کا رستم ہو کر ظالم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ احتجاج بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے شکست کھائے ہوئے زخمی کی طرح بے جان ہو کر اسپتال پہنچ گیا تھا۔

جلال اکبر نے ناگواری سے پوچھا۔ "جب گھر والا اسپتال میں ہے تو وہ یہاں کیا لینے آئی ہے؟"

بلال کو یہ سن کر دکھ پہنچا کہ اس کی شہناز کا باپ، اس کا ہونے والا سسر اسپتال میں ہے۔ اس نے کہا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ کچھ رقم مانگنے آئی ہوگی۔ یوں بھی رستم آپ کا خاص وفادار ہے۔ آپ کو اس کی عیادت کے لئے وہاں جانا چاہئے۔"

"میں تم سے بہتر جانتا ہوں، مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار کا ایک نوٹ نکالتے ہوئے بولا۔ "اس وقت اسے دواؤں کی ضرورت ہوگی۔ میری عیادت کی نہیں......"

وہ اس نوٹ کو ملازم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ اسے جا کر دے دو۔ اور کہنا، فرصت ملے گی تو چودھری صاحب اسپتال کا چکر لگائیں گے۔"

وہ پیسے دے کر وہاں سے چلا گیا۔ بلال نے ملازم کو روکتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو۔ یہ روپے مجھے دو۔ میں اس سے ملتا ہوں۔"

وہ ملازم کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کے باہر آگیا۔ رستم کی بیوی چادر میں لپٹی سر جھکائے ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ بلال کو دیکھتے ہی لپک کر اس کے قدموں میں گرتے ہوئے بولی۔ "میرے آدمی کو بچالیں چودھری جی......! وہ اسپتال میں تڑپ رہا ہے۔ ڈاکٹر مہنگی مہنگی دوائیں لکھ رہے ہیں۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ وڈے چودھری جی تو جیسے رستم کو بھول ہی گئے ہیں۔ میں کہاں جاؤں؟ کس سے فریاد کروں؟"

وہ فوراً ہی اسے گاڑی میں بٹھا کر اسپتال پہنچ گیا۔ رستم اسے دیکھ کر بولا۔ "آپ......؟ وڈے چودھری جی نہیں آئے؟"

"شاید تم ان کے کام کے نہیں رہے ہو؟"

رستم ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ بلال نے فوراً ہی تجویز کردہ دوائیں منگوالی تھیں۔ رستم کی بیوی پھل اور جوس کے پیکٹ دکھاتے ہوئے بولی۔ "یہ سب چھوٹے چودھری جی کی مہربانی ہے۔ اب تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

وہ بیڈ پر لیٹا بڑی احسان مندی سے بلال اکبر کو دیکھ رہا تھا۔ آنسو بھرے لہجے میں بولا۔ "آپ مجھ غریب کے پاس آئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیسے شکریہ ادا کروں؟"

اس نے پوچھا۔ "کتنے دنوں سے بیمار ہو؟"

"آج رات سینے میں درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں۔ یہاں آیا تو ڈاکٹر نے کہا، یہ دل کا دورہ ہے۔"

"تم تو شیر کا کلیجا رکھتے ہو پھر یہ دل کا دورہ کیسے پڑ گیا؟"

وہ کن انکھیوں سے اپنی بیوی کو دیکھنے لگا۔ اس نے اپنی گھر والی کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ وڈے چودھری نے اس سے کتنا شرمناک مطالبہ کیا ہے۔ وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "کیا بتاؤں سرکار......! بس......"

بلال اس کی بے چینی کو بھانپ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"آپ کی انسانیت اور رحم دلی دیکھ کر جی کرتا ہے' دل کا سارا بوجھ ہلکا کردوں جو دیواروں سے بھی کہتے ہوئے ڈرتا ہوں' وہ سب آپ سے کہہ دوں۔"

"تو پھر کہو......"

اس نے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم ذرا باہر جاؤ......"

وہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی۔ تنہائی ملتے ہی وہ رونے لگا۔ روتے روتے کہنے لگا۔ "کیا بتاؤں سرکار......! وڈے چودھری جی نے میری ساری وفاداریوں کو مٹی میں ملا دیا ہے۔"

بلال اکبر توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ اسے تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔ "میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وڈے چودھری میری بیٹی پر نیت خراب کریں گے۔"

اتنا سنتے ہی بلال کے اندر جیسے آگ بھر گئی۔ وہ جسے اپنی امانت سمجھ کر خود اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا، بڑا بھائی اس کی آبرو لوٹنے کی فکر میں تھا۔ رُستم بولتا جارہا تھا اور وہ غصہ برداشت کرتے ہوئے سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "اب کیا کرو گے؟"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "آپ میرے لئے کچھ کریں۔ نہیں تو میں مرجاؤں گا۔"

بلال کے جی میں آرہا تھا' اسے طعنے دے اور پوچھے...... دوسروں کی بہنوں اور بیٹیوں اپنے آقا کے پاس پہنچاتے وقت تمہیں موت کیوں نہ آئی۔ کتنے خوش نصیب ہو کہ تمہاری بیٹی میری سانسوں کے قریب آکر بھی بے داغ ہے......

اس نے یہ بات اس کے منہ پر نہیں کہی۔ دل نے کہا۔ "میں رُستم پر کوئی احسان نہیں کررہا ہوں۔ شہناز میری امانت ہے۔ میں اپنی امانت کی حفاظت کرتا آیا ہوں اور اب تو اسے پوری طرح تحفظ دینا ہی ہوگا۔"

وہ اپنے بھائی کی بدنیتی پر دل ہی دل میں کھول رہا تھا۔ رُستم نے کہا۔ "آپ نے میرے لئے کچھ نہ کیا تو میں طبیعت سنبھلتے ہی بیوی اور بیٹی کو لے یہاں سے بھاگ جاؤں گا پھر کبھی وڈے چودھری کی صورت نہیں دیکھوں گا۔ وہ آپ کے بھائی ہیں۔ میں ان کی شان میں گستاخی کررہا ہوں۔ آپ مجھے سزا دے سکتے ہیں لیکن جو سچ ہے' وہی کہہ رہا ہوں۔"

بلال اکبر سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ رستم نے کہا۔ "آپ بہت اچھے ہیں سرکار......! مجھے اپنا غلام بنالیں۔ میں ساری زندگی آپ کے قدموں کی خاک بن کر رہوں گا۔"

اس نے دلاسا دیا۔ "تمہاری بیٹی کو کچھ نہیں ہوگا۔ نہ ہی یہاں سے بھاگنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی میرا غلام بننا ضروری ہے۔ شہناز میری تحویل میں عزت آبرو سے رہے گی۔ تم یہاں آرام سے اپنا علاج کراؤ۔"

سیاستدان کسی معاملے میں اپنی سیاست سے باز نہیں آتے۔ بلال اکبر انسانیت کے ناتے اور اپنی محبوبہ کی خاطر اس سے ملنے آیا تھا لیکن اسے جلال اکبر کے خلاف زہر اگلتے دیکھ کر یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ وڈے چودھری کا ڈسا ہوا ہے۔ بیٹی کی فکر میں اسپتال کے بستر پر پہنچ گیا ہے۔ اس مہرے کے سینے میں بھائی کے ڈھیروں ایسے راز دفن ہیں جو پٹارے سے باہر آجائیں تو اسے ایم این اے کی کرسی سے نیچے گرا سکتے ہیں۔

یہ اندیشہ بھی تھا کہ بھائی کو رستم کی غداری کی بھنک ملے گی تو وہ اسے فوراً ہی قتل کروادے گا۔ اس لئے اس نے رُستم کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ آئندہ کیا کرنے والا ہے۔

اس نے رُستم کو سمجھایا۔ "تم نے ابھی جو باتیں مجھ سے کی ہیں' وہ کسی اور کو نہ بتانا۔ کسی پر یہ ظاہر نہ کرنا کہ تم بھائی جلال سے بدظن ہوگئے ہو۔ اپنے گھر والوں سے بھی یہی کہتے رہو کہ کل بھی بھائی کے وفادار تھے' آج بھی ہو مگر درپردہ میرے کام آتے رہو گے تو میں تمہاری بیٹی کو اور پورے گھر کو تحفظ دیتا رہوں گا۔"

"میں سمجھ گیا حضور! وفادار آپ کا رہوں گا لیکن دکھاوے کے لئے وڈے چودھری جی کا غلام بن کر رہوں گا۔"

"ہاں' بھائی جلال کو یہ یقین ہونا چاہئے کہ تم ان کا ظلم سہنے کے باوجود بدظن نہیں ہوئے ہو۔"

پھر وہ ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ "کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے پیغام بھجوا دینا۔ تمہاری ہر ضرورت پوری ہوتی رہے گی۔"

اقتدار حاصل کرنے کے لئے لہو کے رشتوں کی جڑیں کاٹنا کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے۔ بلال اکبر کو ایک سنہری موقع مل گیا تھا۔ وڈے بھائی کی وڈی اسمبلی میں پہنچانے کے لئے اس کا وفادار ملازم خود ہی مہرہ بننے کے لئے اس کی جھولی میں آگیا تھا۔

☆☆☆

شہروز اپنا حلیہ بدل چکا تھا۔ خفیہ پناہ گاہ سے باہر آکر مہوش سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ اسے دیکھ کر بے اختیار ہنسنے

لگی۔ اس نے پوچھا۔ "کیوں ہنس رہی ہو؟ کیا اس گٹ اپ میں اچھا نہیں لگ رہا ہوں؟"

وہ اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "یہ داڑھی... یہ بڑے بڑے بال...... بلیک چشمہ...... سچ پوچھو تو پکے دہشت گرد لگ رہے ہو۔"

پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "اتنے خطرناک معاملے میں ہاتھ ڈال کر حاصل کیا ہوا؟ ڈیڈ ہمیشہ گہری سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں۔ تم نے جلال اکبر کو اغوا کیا' اسے ٹارچر کیا۔ پتا نہیں ڈیڈ تمہیں کس طرح سزا سے بچائیں گے؟ میں تو سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی رہتی ہوں۔"

"تم انکل کی جان ہو اور میں تمہاری جان ہوں۔ وہ میری جان مصیبت میں ڈال کر آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ میری سلامتی اور بہتری کے لئے ضرور کچھ کر رہے ہوں گے۔"

"پتا نہیں کیا کر رہے ہیں؟ اس تبدیلی کے بعد بھی تم محدود زندگی گزار رہے ہو۔ یونیورسٹی نہیں آ سکتے۔ اپنے فلیٹ میں نہیں جا سکتے۔ ویسے تم اور ڈیڈ اس کہاوت پر پورے اترتے ہو کہ آ بیل مجھے مار......"

وہ مسکرا کر بولا۔ "کیا زندگی بھر یہی طعنہ دیتی رہو گی؟"

"جب تک حالات نارمل نہیں ہوں گے' تم میرے طعنوں کی زد میں رہو گے۔"

انہیں ایک دوسرے سے مل کر بڑی آسودگی مل رہی تھی۔ زندگی کسی حد تک خوبصورت دکھائی دے رہی تھی لیکن اس حد سے آگے بھی یہ خو[illegible]ت تھی یا نہیں؟ اس کے لئے بے یقینی پیدا ہو گئی تھی۔

ایک حقیری چیونٹی ہاتھی [illegible]ے بھاری بھرکم جانور کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ شہ[illegible] جلال اکبر کو اس کے برے انجام تک پہنچا نہیں پا رہا تھا لیکن اس کی سونڈ میں گھس کر اسے بے چین کر رہا تھا۔

جلال اکبر کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ اس کے خاص ماتحت یعقوب نے آ کر اطلاع دی تھی کہ رانا مجید نے اپنے پی اے کو سسپنڈ کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ پی اے خود اس خط کے سلسلے میں دھوکا کھا گیا تھا۔ رانا مجید بڑا مکار ثابت ہوا۔ اس نے ایک نقلی کانفیڈنشل فائل اپنے آفس میں رکھوائی تھی اور اس فائل کے اصل کاغذات کسی دوسری جگہ چھپا دیے تھے۔

جلال اکبر کو وہ اصل کاغذات اب خواب میں نظر آ سکتے تھے یا پھر عدالت میں دکھائی دینے والے تھے۔ اس کی پارٹی اقتدار میں تھی۔ پارٹی کے تمام بڑے لیڈر آئی جی رانا مجید پر دباؤ ڈال رہے تھے، اسے سمجھا رہے تھے اور حکمرانوں کی حیثیت سے دھمکی بھی دے رہے تھے کہ وہ سمجھوتا نہیں کرے گا تو کسی دور دراز کے چھوٹے سے علاقے میں اس کا تبادلہ کرا دیا جائے گا۔ عدالت میں اپنی مرضی کا منصف بٹھایا جائے گا پھر پیشی کی تاریخیں بڑھاتے بڑھاتے اس کیس کو کمزور بنا دیا جائے گا۔

وہ اقتدار میں رہنے والے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ رانا مجید کو اپنے داماد کی سلامتی منظور تھی۔ اس نے بیٹی اور ہونے والے داماد سے کہا۔ "ہمیں موجودہ حالات میں سمجھوتا کرنا ہی ہوگا۔ میں نے اصل خط دشمن کے ہاتھ لگنے نہیں دیا تھا مگر اب یہ حکمتِ عملی کام نہیں آ رہی ہے۔ وہ حکمران ہیں' صرف میرا ہی نہیں' جج حضرات کا بھی تبادلہ کرا سکتے ہیں۔ کسی زرخرید منصف کے ذریعے ثریا کے کیس کو کمزور بنا سکتے ہیں۔"

شہروز نے کہا۔ "انکل! آپ کی باتوں سے لگتا ہے' ہم جیتی ہوئی بازی ہار جائیں گے۔"

صبوحی نے کہا۔ "ہمیں جیت کر کرنا بھی کیا ہے؟ تم اپنے دوست اکرم اور اس کی منگیتر کے لئے انصاف حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اس سلسلے میں کتنی مصیبتوں سے گزر رہے ہو' کچھ اس کا احساس ہے؟"

رانا مجید نے کہا۔ "یہی میں سمجھا رہا ہوں۔ یہ حکمران بن کر رہنے والے ثریا کے کیس کو کمزور بنا کر تمہارا کیس مضبوط کر دیں گے۔ تم نے جلال اکبر کو اغوا کیا' اس پر تشدد کیا۔ تمہیں اغوا کا مجرم اور دہشت گرد ثابت کرنا ان کے لئے آسان ہو جائے گا۔"

شہروز نے کہا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے جو مجرم ہے، وہ تو بچ نکلے گا اور میں اسے مجرم ثابت کرنے کے لئے ایک ذرا قانون کو ہاتھ میں لیتے ہی خود مجرم بن گیا ہوں۔"

صبوحی نے کہا۔ "بس بہت ہو چکا ہے۔ تم نے اپنے دوست اکرم کے لئے بہت کر لیا، آگے کچھ نہیں کرو گے۔ ڈیڈ......! آپ ان سے سمجھوتا کریں۔ کسی بھی طرح شہروز کی گردن چھڑائیں۔"

"گردن اسی طرح چھوٹے گی کہ میں ثریا کا کیس اس شرط پر واپس لوں کہ جلال اکبر پہلے شہروز کے خلاف کیس واپس لے اور وہ ایسے سمجھوتے کے لئے راضی ہے۔"

"ٹھیک ہے انکل۔! ہم شاہانِ وقت سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ لوگ کبھی گرفت میں نہیں آتے۔ میں روپوشی سے تنگ آ چکا ہوں۔ آپ آج ہی ان سے سمجھوتا کر لیں۔"

رانا مجید قانون کا محافظ تھا۔ پولس کا اعلیٰ افسر تھا۔ بڑے بڑے شاطر مجرموں کو اپنے شکنجے میں لے آتا تھا لیکن سیاست کے چودھری جلال اکبر سے ٹکرا کر پتا چلا کہ وہ پہاڑ کے آگے محض ایک اونٹ ہے۔ آخر اسے سمجھوتا کرنا ہی پڑا۔

☆☆☆

شہناز اپنے مکان کی چھت پر سے دوسرے مکان کی چھت پر کھڑی ایک سہیلی سے باتیں کررہی تھی۔ ایسے وقت اس نے دور سے آتی ہوئی پجیرو کو دیکھا تو دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سہیلی سے بولی۔ ''چودھری بلال کی گاڑی اِدھر آرہی ہے۔''

وہ دوڑتی ہوئی سیڑھیوں سے اُترتی ہوئی ماں سے بولی۔ ''بے بے! چودھری بلال کی گاڑی اِدھر آرہی ہے۔ وہ ابّے کی خیریت پوچھنے آرہے ہوں گے۔''

ماں نے کہا۔ ''کوئی ضروری نہیں ہے۔ اِدھر سے گزر رہے ہوں گے۔ ہماری حیثیت کیا ہے کہ وہ یہاں آئیں گے۔''

وہ ایک آئینے کے سامنے رُک کر خود کو دیکھتے ہوئے دل میں بولی۔ ''حیثیت تو ایسی ہے کہ کچے دھاگے سے بندھے چلے آتے ہیں۔''

پجیرو مکان کے سامنے آکر رُک گئی۔ اس کے سارے دروازے کھلے۔ بلال اکبر، رُستم ایک منشی، دو گن مین اور ایک قاضی صاحب گاڑی سے نکل کر چلے آرہے تھے۔ رُستم تیزی سے دوڑتا ہوا مکان کے اندر آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اپنی بیوی سے بولا۔ ''شنو کی ماں۔! ربّ تعالیٰ ہم پر مہربان ہے۔ چھوٹے چودھری ہماری شنو سے نکاح پڑھوانے آئے ہیں۔''

شہناز خوشی کے مارے چکرا گئی۔ گرنے کے انداز میں منجھی پر بیٹھ گئی۔ سامنے والے کمرے میں ماں باپ چادریں بچھا رہے تھے۔ براتیوں کو بٹھایا جارہا تھا۔ ماں نے آکر بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''اری جلدی کر۔ پانچ منٹ میں غسل کرلے۔ میں نے سُرخ جوڑا نکالا ہے۔ اسے پہن لے۔ دیر نہ کر، وڈے داماد جی ہوا کی طرح آئے ہیں، ہوا کی طرح گزر جائیں گے۔''

وہ مہمانوں کے لئے شربت بنانے چلی گئی۔ شہناز جیسے ہوا میں اُڑی جارہی تھی۔ سحر زدہ سی ہوکر آدھے گھنٹے کے اندر دلہن بن گئی۔ بلال کا حکم تھا دیر نہ کی جائے۔ قاضی صاحب نے دونوں کا نکاح پڑھا دیا۔ رُستم کچھ کھانے پینے کا انتظام کرنا چاہتا تھا، بلال نے کہا۔ ''کوئی تکلف نہ کرو۔ یہ میرا گھر ہے۔ کسی دن آکر کھاؤں گا۔ بس اپنی بیٹی کو رُخصت کرو۔''

ماں بیٹی کو گلے سے لگا کر رونے لگی۔ رُستم بھی خوشی سے رو رہا تھا۔ ایسے ہی وقت دروازے پر ایک زوردار لات ماری گئی۔ وہ دھڑاکے سے کھلتا چلا گیا۔ جلال اکبر کے دو گن مین دندناتے ہوئے اندر آئے۔ بالکل حملہ آوروں کا انداز تھا لیکن وہاں بلال اکبر کو دیکھتے ہی وہ ایکدم سے ڈھیلے پڑ گئے۔ غبارے سے ہوا نکل گئی۔

بلال نے گرج کر پوچھا۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟ اس طرح کیوں آئے ہو؟''

دونوں سہمے ہوئے تھے۔ ان کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ پھر گرجتے ہوئے بولا۔ ''اچھی طرح دیکھ لو۔ یہاں قاضی صاحب ہیں، دلہن ہے اور ہم ہیں۔ رُستم رو رہا ہے۔ ہم نے گن پوائنٹ پر نکاح پڑھوایا ہے۔ آئندہ اِدھر آؤ گے تو اپنے پیروں سے چل کر نہیں جاسکو گے۔ جاؤ، بھاگ جاؤ یہاں سے......''

دونوں گن مین پلٹ کر وہاں سے بھاگتے چلے گئے۔ بلال نے رُستم سے کہا۔ ''بھائی جلال کو یہی سمجھنا چاہئے کہ میں جبراً تمہاری بیٹی کو یہاں سے لے گیا ہوں۔ اب چلتا ہوں۔''

شہناز سُرخ جوڑے میں گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ بلال نے کہا۔ ''اُٹھو......!''

وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ بلال نے کہا۔ ''اب تم شرعی طور پر میری ہو۔ میں تمہیں ہاتھ لگا سکتا ہوں۔''

یہ کہتے ہی اس نے اسے دونوں بازوؤں میں اُٹھا لیا۔ ایک فاتح کی طرح چلتا ہوا مکان سے باہر آیا۔ پھر اسی شان سے پجیرو کے پاس پہنچا۔ ایک گن مین نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس نے دلہن کو بڑے پیار سے وہاں بٹھاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''اب تو میں چھو بھی سکتا ہوں۔ پکڑ بھی سکتا ہوں اور جکڑ بھی سکتا ہوں۔''

وہ شرم سے دہری ہورہی تھی۔ وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر اس کے برابر آگیا۔ براتی پیچھے بیٹھ گئے۔ ماں باپ کے سر سے ایک پہاڑ اتر گیا تھا۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھ گئی تھی۔ بیٹی ان سے دور ہوتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

☆☆☆

جلال غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اِدھر سے اُدھر جارہا تھا۔ ماں جی سر پکڑے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جھنجلا کر کہہ رہا تھا۔ ''رُستم ہمارے لئے جان کی بازی لگاتا رہا ہے اور آپ کے لاڈلے نے کیا کیا ہے؟ جبراً اس کے گھر میں گھس کر اس کی بیٹی سے

نکاح پڑھوایا ہے۔"

"مجھے تو یقین نہیں آتا کہ بلال ایک کمین کی بیٹی کے لئے اتنا گر جائے گا؟ ایسا قدم اٹھانے سے پہلے ماں سے بھی نہیں پوچھے گا؟"

"اس کے دماغ میں خناس بھرا ہے۔ ایم این اے بننا چاہتا ہے۔ مجھ سے دشمنی مول لینا چاہتا ہے۔ میری بہت سی کمزوریاں معلوم کرنا چاہتا ہے۔"

"تمہاری سیاست میں یہ رستم کی بیٹی کہاں سے آ گئی؟"

وہ ایک جگہ رکتے ہوئے بولا۔ "آپ نہیں سمجھیں گی۔ سیاست دانوں کی سب سے بڑی طاقت رستم جیسے غنڈے ہوتے ہیں اور سب سے بڑی کمزوری بھی یہی غنڈے ہوتے ہیں۔ گھر کے بھیدی بن کر رہتے ہیں اور بلال میرے بھیدی پر ہاتھ ڈال رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "وہ غنڈا تمہارے لئے اتنا اہم تھا تو اسے ہمیشہ اپنی چھاؤں میں رکھنا چاہئے تھا۔ تم سے تو اتنا بھی نہ ہوا کہ اسپتال جا کر اس کی خیر خیریت معلوم کرتے اور دوا دارو کے لیے پیسے دیتے۔"

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ فرعون کے دل میں اندیشہ پیدا ہو جائے تو پھر فرعونیت کے دن گنے چنے رہ جاتے ہیں۔ وہ پہلی بار ذرا ٹوٹ رہا ہے۔ وہ جو طاقت سے زیر نہیں ہو رہا تھا، ہتھیاروں سے نہیں مر رہا تھا، قانون کی تلوار بھی اسے کاٹ نہیں سکتی تھی۔ اب وہ کچھ پریشان ہو رہا تھا۔

بلال کو بڑی دیر بعد یہ عقل آئی تھی کہ گھر کے بھیدی کو گرفت میں لینا چاہئے۔ یوں کہنا چاہئے، اسے براہ راست عقل نہیں آئی۔ شہناز کی محبت اسے اس راستے پر لے آئی۔ رستم اپنی بیٹی کی وجہ سے خود ہی گرفت میں آ گیا۔

جلال اکبر شہ زور تھا، ناقابلِ شکست تھا، قدم قدم پر میدان مارنا جانتا تھا۔ اب اسے تقدیر کی مار پڑنے والی تھی۔ ماں جی زیرِ لب بڑبڑا رہی تھی۔

ایسے وقت رستم نے حاضر ہو کر کہا۔ "سرکار! میں تو لٹ گیا۔ آپ کے بندوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کس طرح گن پوائنٹ پر مجھے مجبور کیا گیا ہے؟"

جلال نے غصے سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ اس نے گن پوائنٹ پر نکاح پڑھوایا اور تم نے پڑھوانے دیا؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں کیا کرتا؟ ایک تو نہتا تھا۔ دوسرا بیمار...... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بھی اس علاقے کے مالک ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ہم ان کے منہ پر کچھ کہنے کی جرات بھی نہیں کر سکتے۔"

وہ رستم کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے آگے گھٹنے ٹیکے، سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ "آپ یقین کریں، وہ مجھے زبردستی اسپتال سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ ایسے وقت میرے پاس ہتھیار ہوتا تو میں ان کا تو کچھ نہیں بگاڑ پاتا مگر اپنی بیٹی کو ضرور گولی مار دیتا۔ نہ وہ رہتی، نہ چھوٹے چودھری اپنی من مانی کرتے۔"

ماں جی اسے حقارت سے گھورتے ہوئے بولی۔ "تیری نیت میں ہی فتور ہے۔ اپنی بیٹی کو اس خاندان کی بہو بنانا چاہتا تھا۔ اپنی اوقات معلوم ہے تجھے...؟ تیری بیٹی یہاں کی رانی تو کیا، نوکرانی بننے کے بھی قابل نہیں ہے۔"

رستم نے ماں جی کی طرف ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں نے بیٹی کے لئے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ آپ چھوٹے چودھری جی سے پوچھ لیں، انہوں نے کیسی زبردستی کی ہے؟"

جلال اکبر نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ماں جی! آپ جائیں۔ ہمیں بات کرنے دیں۔"

وہ جھنجلاتی اور بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ جلال نے پوچھا۔ "کیا وہ دلہن کو لے کر یہاں حویلی میں آئے گا؟"

"پتا نہیں سرکار! مجھے تو لگتا ہے، وہ اپنی زمینوں پر ہی رہیں گے۔ ماں جی کو منانے کے بعد میری بیٹی کو یہاں لائیں گے۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "وہ یہاں آئے گی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔ تمہاری وفاداریوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے سر پر بٹھا کر تم سے رشتے داری کروں گا۔"

وہ سر جھکائے بڑے اطمینان سے چپ تھا۔ یہ جانتا تھا کہ وہ گرجنے والا بادل ہے۔ اس کے داماد پر برس نہیں پائے گا۔ جلال نے اس کے قریب ہو کر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیا یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ اس نے تمہارے جیسے وفادار کو کمزور بنانے کے لئے اپنا سسر بنا لیا ہے؟ بعد میں وہ تم باپ بیٹی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکے گا۔"

وہ عاجزی سے بولا۔ "آپ کی طرح وہ بھی حاکم ہیں۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے تو بس آپ کا آسرا ہے۔ آپ ہی مائی باپ ہیں۔ مجھ پر برا وقت آ پڑا ہے۔ میرے لئے کچھ کریں۔"

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہوں.... ہمارے لئے ہمیشہ جان لڑاتے آئے ہو۔ تم سے جان مانگتے ہیں، وہ بھی دینے کو تیار رہتے ہو۔ آج ایک

اور جان مانگتے ہیں۔ دو گے؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "آپ حکم کریں۔"

جلال نے گولی مارنے کے انداز میں کہا۔ "اپنی بیٹی کو گولی ماردو......"

اس نے ایکدم سے گھبرا کر اسے دیکھا۔ پھر فوراً ہی نظریں جھکالیں تا کہ گھبراہٹ ظاہر نہ ہو۔ جلال اکبر نے کہا۔ "وہ مر جائے گی، تو بلال تمہیں اپنے دباؤ میں نہیں رکھے گا پھر تم اس سے اپنی بیٹی کا انتقام لے سکو گے۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر......"

"اُس نے تمہیں نہتا کر کے نکاح پڑھوایا۔ اب تو رشتے داری ہوگئی ہے۔ بیٹی سے ملنے جاؤ گے تو ہتھیار تمہارے پاس ہوگا۔"

رستم نے کہا۔ "وہ کہہ رہے تھے' کل دلہن کو لے کر وڈے پیر کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جائیں گے۔"

وہ اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "پھر تو کھلا میدان ملے گا۔ بلال میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔ میں اُس گھنٹی کو ہمیشہ کے لئے بند کردینا چاہتا ہوں۔ کل تم پوری تیاری رکھو۔"

وہ ایک طرف جاتے ہوئے بولا۔ "میں بھی ابا جی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاؤں گا...... بھائی پر بھی پڑھ لوں گا......"

وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

☆☆☆

بلال لان میں ٹہلتا ہوا موبائل فون پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ ایسے وقت احاطے میں ایک کار داخل ہوئی۔ اس نے کار کو دیکھتے ہی سمجھ لیا' ماں جی آئی ہے۔ پھر فون پر کہا۔ "سوری...... میں بعد میں کال کروں گا۔"

کار پورچ میں آ کر رک گئی۔ اگلی سیٹ سے مسلح باڈی گارڈ نے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ماں جی نے باہر آتے ہوئے بیٹے کو دیکھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "آپ اطلاع دیتیں تو خود لینے چلا آتا۔ آپ تو اچانک......"

وہ ایک ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "دور رہو۔ خبردار! میرے قریب نہ آنا۔"

وہ رک کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "اچھا تو غصہ دکھانے آئی ہیں؟ ٹھیک ہے۔ آپ دل کی بھڑاس نکالیں پھر میں اپنی صفائی پیش کروں گا۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "مجھے تمہاری کوئی صفائی نہیں سننی ہے...... اُس نیچ ذات کو چوٹی سے پکڑ کر باہر نکالو ورنہ میں اس گھر میں پاؤں نہیں رکھوں گی۔"

"ماں جی! وہ میری منکوحہ ہے۔ میں نے باقاعدہ اس سے نکاح پڑھوایا ہے۔"

"کیوں پڑھوایا ہے؟ کیا تم نے ماں سے اور بڑے بھائی سے اجازت لی تھی؟"

"اجازت کبھی نہیں ملتی، اس لئے نہیں لی۔ آپ یہی کہتیں کہ ایک غنڈے بدمعاش قاتل کی بیٹی آپ کی برابری نہیں کرے گی۔"

"یہی کہنے آئی ہوں۔ ایسی لڑکیاں ہماری حویلی میں کنیزیں اور داشتائیں بن کر رہتی ہیں۔"

"افسوس ماں جی! آپ عورت ہو کر عورتوں کی توہین کرنے والی باتیں کر رہی ہیں۔ جو ابا جی نے اپنی زندگی میں کیا، جو بھائی جلال کر رہے ہیں' وہ میں نہیں کرسکتا۔ اس لئے نکاح پڑھوالیا ہے۔"

"میں اسے حویلی میں گھسنے نہیں دوں گی۔"

"آپ کی مرضی ہے۔ ویسے آپ نے دنیا دیکھی ہے۔ یہ تو جانتی ہیں کہ وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ ساس کی جگہ بہو لے لیا کرتی ہے۔"

"کیسے بیٹے ہو' پاؤں کی دھول ماں کے سر پر ڈال رہے ہو؟"

"ادنیٰ خاندان کی ہو یا اعلیٰ خاندان کی...... کسی کے پاؤں کی دھول ماں کے سر پر نہیں ڈالی جاتی۔ یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ آج نہیں تو کل آپ اسے بہو کو تسلیم کرلیں گی۔"

ماں نے ناگواری سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ بولا۔ "مجھے جلدی نہیں ہے۔ میں آنے والے اُس کل کا انتظار کرتا رہوں گا۔"

وہ بیٹے کو شکست خوردہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "آخری بار پوچھتی ہوں' تم اسے گھر سے اور اپنی زندگی سے نکالو گے یا نہیں؟"

"شرعی نکاح توڑنے کے لئے نہیں... ہمیشہ جوڑنے کے لئے کیا جاتا ہے۔"

وہ غصے سے پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی کار میں جا کر بیٹھ گئی۔ بلال سنجیدگی سے مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ کار اسٹارٹ ہو کر احاطے سے باہر جا رہی تھی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو شہناز نے کوٹھی سے باہر آ کر کہا۔ "شاید آپ نے پہلی بار میری خاطر ماں جی کو ناراض کیا ہے؟"

وہ بولا۔ ”میں نے جائز بات کہی ہے اگر ماں بھی شرع کے خلاف بولے تو اس کی بات نہیں ماننی چاہئے۔“

حویلی کے سب ہی افراد ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے تھے۔ بلال نے صحیح وقت پر صحیح چال چلی تھی۔ یہ مخالفت اب رنگ لانے والی تھی۔

☆☆☆

جلال اکبر کی پجیرو مزار کے سامنے آ کر رک گئی۔ مزار کے اندر اور باہر دور تک سناٹا اور ویرانی تھی۔ عقیدت مند صرف جمعرات کی شام کو آیا کرتے تھے۔ ورنہ کوئی وہاں سے اتفاقاً گزرنے والا کبھی نماز پڑھنے اور دعائیں مانگنے کے لئے رک جاتا تھا۔

جلال اکبر نے پجیرو سے اترتے ہوئے رستم سے کہا۔ ”تم نے کہا تھا‘ بلال آنے والا ہے۔ یہاں اس کی گاڑی نظر نہیں آ رہی ہے۔“

وہ بولا۔ ”وہ آتے ہی ہوں گے۔ میں اندر جا کر مجاور کی یہاں سے چھٹی کرتا ہوں۔ آپ جس مقصد سے آئے ہیں‘ اُس کے لئے یہاں کسی چشم دید گواہ کو نہیں ہونا چاہئے۔“

وہ قائل ہو کر بولا۔ ”بے شک۔ یہاں جو ہوگا‘ گہری رازداری سے ہوگا۔ ایسے معاملات میں میں نے صرف تم پر ہی بھروسا کیا ہے۔“

وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مزار کی چار دیواری میں داخل ہوئے تو جلال وہاں بلال کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہ ہاتھوں میں گن لئے باپ کی قبر کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ جلال نے رستم کو گھور کر کہا۔ ”تم نے کہا تھا‘ یہ تمہاری بیٹی کے ساتھ فاتحہ پڑھنے آئے گا؟“

بلال نے اپنی گن کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”فاتحہ تو پڑھی جائے گی مگر کس پر پڑھی جائے گی؟ یہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔“

جلال اکبر کی چھٹی حس کہہ رہی تھی‘ وہ بری طرح پھنس گیا ہے۔ اس نے گھورتے ہوئے کہا۔ ”رستم ......!“

وہ بولا۔ ”آنکھیں نہ دکھائیں وڈّے چودھری جی......! میں لاکھ درندہ سہی۔ پر اپنی بیٹی کے لئے موم کا دل رکھتا ہوں۔ آپ کے حکم سے نہ اُسے گولی مار سکتا ہوں‘ نہ آپ کو موقع دے سکتا ہوں کہ میرے داماد کو مار کر میری بیٹی کو بیوہ بنا دیں۔“

جلال نے پریشان ہو کر اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔ اُدھر وہ دونوں مسلح تھے۔ اس نے غصے سے کہا۔ ”نمک حرام! تو مجھے چھوڑ کر اس کا ساتھ دے رہا ہے؟“

بلال اکبر نے کہا۔ ”بھائی جلال! مجھ سے بات کرو۔ اب سے چار برس پہلے یہ قبر نہیں تھی۔ اباجی یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ تم نے اُن سے کہا تھا.... کیا کہا تھا....؟ یاد کرو....“

جلال اکبر کو یاد تھا۔ اس نے باپ سے کہا۔ ”میں آخری بار پوچھتا ہوں‘ آپ میرے لئے ایم این اے کی سیٹ خالی کریں گے یا نہیں......؟“

بلال اکبر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”یاد آ رہا ہے بھائی جلال......! اباجی کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بیٹا نیشنل اسمبلی میں پہنچنے کے لئے باپ کو گولی مارے گا جو بوڑھے جلدی نہیں مرتے‘ اپنے وارث کے لئے جگہ نہیں چھوڑتے، وہ حرام موت مرتے ہیں۔ تم نے یہاں...... اسی جگہ انہیں حرام موت مار ڈالا۔“

جلال اکبر حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے بولا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ میں اباجی سے بہت محبت کرتا تھا۔ میں نے انہیں قتل نہیں کیا ہے۔ کوئی میرے خلاف گواہی نہیں دے گا۔“

بلال نے رستم کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ چشم دید گواہ ہے۔ تم نے اس وفادار کے سامنے اباجی کو یہاں سلایا ہے۔ آج وہی وقت لوٹ کر آیا ہے۔“

جلال اکبر نے پریشان ہو کر رستم کو دیکھا۔ بلال باپ کی قبر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”یہ وہی جگہ ہے اور میرا بھی وہی مطالبہ ہے‘ ایم این اے کی سیٹ خالی کر دو۔ پہلے تمہارے خلاف کوئی گواہ نہیں تھا۔ آج کے بعد میرے خلاف کوئی چشم دید گواہ نہیں ہوگا۔ یہ بے چارہ تمہارا بنایا ہوا اندھا ہے...... دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتا...... دیکھتا بھی ہے تو بھول جاتا ہے۔“

اس نے ٹریگر کو دبایا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی جلال اکبر اچھل کر باپ کی قبر پر گر پڑا۔ اِدھر سے اُدھر تڑپنے لگا۔ سرخ گلابوں کی چادر چڑھانے والا، باپ کی قبر پر لہو کی سرخی چڑھا رہا تھا۔

بلال اکبر نے دوسری گولی ماری‘ تڑپنے والے کو قرار آ گیا۔ وہ جہاں تھا‘ ہمیشہ کے لئے وہیں ساکت ہو گیا۔

اس نے اپنی گن رستم کو دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہاری ہے۔ تم نے قتل کیا ہے۔ خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ میں جلد ہی ایم این اے کی کرسی پر بیٹھ کر تمہاری سزا کو کم سے کم کراؤں گا۔“

پھر اس نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”فاتحہ پڑھو......“

☀